**ناڈین گورڈیمر (Nadine Gordimer)**

ناڈین گور ڈیر جنوبی افریقا سے تعلق رکھنے والی ادیب ہیں۔ وہ ۱۹۲۳ میں جوہانسبرگ میں پیدا ہوئیں اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ انھوں نے اپنی تعلیم پوری کیے بغیر یونیورسٹی چھوڑ دی اور مختلف رسالوں کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ The Soft Voice of Serpent ۱۹۵۳ میں شائع ہوا۔

بہ قول ناڈین گورڈیمر، کہانیاں افسانہ نگار کے احساس اور تخیل میں جنم لیتی ہیں۔ کھانی لکھنے کے لیے افسانہ نگار داخلی یا خارجی کسی بھی کیفیت میں اپنے پسینے، خون جگر، آنسوؤں کی ایک بوند کی مدد سے ایسی حدت اور شدت پیدا کر دیتا ہے کہ کاغذ بھی خاکستر ہو جاتا ہے۔

" ناڈین گورڈیم اپنے پڑھنے والوں کو اپنی کہانیوں کے ذریعے مختلف تہذیبوں کا سفر کراتی ہیں ۔ کبھی موز بیک کی جنگ کا منظر، کبھی جنوبی فرانس کے ساحل کا احوال، کبھی جوہانسبرگ کے متمول علاقے کی روداد اور کبھی لندن کی عقبی گلیوں کی داستانیں۔ ان کا مشاہدہ اتنا گہرا ہے کہ وہ انسانی بستیوں اور گھروں میں تیزی سے تبدیل ہوتے ہوے رویوں کو بڑی چابک دستی سے اپنی گرفت میں لے آئی ہیں۔

ان کی کہانی The Ultimate Safari جس کا ترجمہ یہاں " کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے، انگریزی میں برطانوی سہ ماہی جریدے Granta کے شمارہ ۲۸ (خزاں ۱۹۸۹) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسے سفر کی کہانی ہے جس میں دادا دادی ، دو پوتے اور ایک پوٹی ایک قافلے کے ساتھ موزمبیک سے ہجرت کرتے ہیں، لیکن اپنی انسانی تفصیلات کے اعتبار سے یہ کہانی کسی بھی آشوب زدہ ملک سے ہجرت کی داستان ہو سکتی ہے۔

ناڈین گورڈیمر نے بے شمار افسانے اور ناول لکھے اور ان کی بہت پذیرائی بھی ہوئی۔ انھیں ۱۹۹۱ میں ادب کا نوبیل انعام ملا۔

نکہت حسن

**ناڈین گور ڈیمر**

انگریزی سے ترجمہ : نکہت حسن

**ہجرت**

AFRICAN ADVENTURE LIVES ON...  
THE YOU CAN DO IT! THE ULTIMATE SAFARI  
WHO LEADERS WITH EXPEDITION OR  
KNOW AFRICA.

(Travel advertisement, Observer, 27 November 1988.)

اُس رات ہماری ماں بازار گئی تو پھر واپس ہی نہیں آئی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ میرا باپ بھی ایک دن اسی طرح چلا گیا تھا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ لیکن وہ تو جنگ لڑ رہا تھا۔ یوں تو ہم بھی جنگ ہی کی حالت میں تھے، لیکن خیر ، ہم تو بچے تھے۔ ہم اپنے دادی دادا کی طرح تھے، جن کے پاس ہتھیار بھی نہیں تھے۔ جن لوگوں سے میرا باپ لڑ رہا تھا حکومت ان کو ڈا کو سمجھتی تھی؛ وہ ہر جگہ ادھم مچائے ہوے تھے۔ ہم سب ان سے جان بچانے کے لیے اس طرح ڈر کر بھاگتے تھے جیسے مرغیاں کتوں سے ڈر کر بھاگ رہی ہوں۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہاں جائیں۔ ہماری ماں اس لیے بازار گئی تھی کہ اسے کسی نے بتایا تھا کہ بازار میں کھانے کا تیل مل رہا ہے۔ ہم اس بات سے بہت ہی خوش تھے، کیوں کہ ہم نے بہت دن سے تیل چکھا تک نہیں تھا۔ ماں کو شاید تیل مل گیا تھا اسی لیے کسی نے اندھیرے میں اسے قتل کر دیا اور اس سے تیل چھین لیا۔ یا شاید اس کی ڈاکوؤں سے مڈ بھیڑ ہو گئی ہو گی۔ اگر آپ کا بھی کبھی ڈاکوؤں سے سامنا ہو تو وہ آپ کو بھی مار ڈالیں گے۔ وہ دو بار ہمارے گاؤں میں آئے ؟ ہم بھاگ کر جھاڑیوں میں چھپ گئے اور جب وہ چلے گئے تب جھاڑیوں میں سے نکل کر اپنے گھروں میں واپس آئے، اور ہم نے دیکھا کہ وہ ہر چیز کا صفایا کر چکے تھے۔ لیکن تیسری دفعہ انھیں گھر میں کوئی چیز نہیں ملی ۔ نہ تیل، نہ کوئی اور کھانے کی چیز ۔ تب انھوں نے گھر کے چھپر اور پرال کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے ہمارے گھر کی چھتیں زمین پر آ پڑیں۔ میری ماں ٹین کی چادروں کے کچھ ٹکڑے لے آئی جن سے گھر کا کچھ حصہ ڈھک دیا گیا۔ اس رات ہم اسی چھت کے نیچے بیٹھے اپنی ماں کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

ہم باہر نکلنے سے ڈرتے تھے، اپنے کام کاج کے سلسلے میں بھی، کیوں کہ ڈا کو واقعی پھر آگئے تھے۔ ہمارے گھر میں تو خیر نہیں آئے ۔ بغیر چھت کا گھر ان کو انسانوں اور سامان سے خالی نظر آیا ۔ مگر پورے گاؤں میں وہ ڈھٹائی سے دندناتے پھرے۔ ہمیں لوگوں کی چیخ پکار اور بھگدڑ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ہم تو اپنی ماں کی ہدایت کے بغیر بھاگنے سے بھی ڈرتے تھے۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں منجھلی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی میرے پیٹ سے ایسے چمٹا ہوا تھا جیسے بندریا کا بچہ اس کے پیٹ سے چمٹا ہوتا ہے، اس طرح کہ اس کے دونوں بازو میری گردن کے گرد تھے اور ٹانگیں میری کمر کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ پوری رات میرا بڑا بھائی گھر کے جلے ہوے شہتیروں میں سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھوں میں تھامے رہا تا کہ اگر ڈا کو اس کو دیکھ لیں تو وہ خود کو ان سے بچا سکے۔

ہم وہاں پورے دن اپنی ماں کا انتظار کرتے رہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سا دن تھا۔ ہمارے گاؤں میں نہ تو کوئی اسکول باقی بچا تھا نہ کوئی گرجا گھر ، اس لیے یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کب اتوار ہے اور کب سوموار۔

جس وقت سورج غروب ہو رہا تھا تو ہماری دادی اور دادا آ گئے۔ کسی نے ان کو اطلاع دے دی تھی کہ ہم بچے گھر میں اکیلے ہیں، ہماری ماں واپس نہیں آئی۔ میں ہمیشہ دادا سے پہلے دادی کا ذکر کرتی ہوں کیوں کہ یہ اسی طرح ہے: ہماری دادی بڑی لحیم شمیم اور قد کاٹھ والی عورت ہے اور ابھی کچھ زیادہ بوڑھی بھی نہیں ہوئی۔ جبکہ ہمارا دادا اتنا چھوٹا ہے کہ آپ سوچ ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے پتلون کے کس کونے میں ہے۔ وہ خواہ مخواہ مسکرانے لگتا ہے، بغیر سمجھے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بال ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے انہیں صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا چھوڑ دیا گیا ہو۔ ہماری دادی ہمیں \_ یعنی مجھے، چھوٹے بھائی، بڑے بھائی اور دادا کو اپنے مکان میں لے آئی۔ ہم تمام وقت بہت ڈرے ہوے رہے (سواے چھوٹے بھائی کے جو دادی کی پیٹھ پر سو رہا تھا ) کہ کہیں راستے میں ڈاکوؤں سے مڈ بھیر نہ ہو جائے۔ ہم بہت دن تک اپنی دادی کے مکان میں انتظار کرتے رہے ۔ شاید ایک مہینے تک۔ ہم بہت بھوکے تھے اور ہماری ماں بھی نہیں آئی تھی۔ جب ہم اپنی ماں کے انتظار میں تھے، کہ وہ آکر ہمیں یہاں سے لے جائے، اس عرصے میں دادی کے پاس ہمارے لیے کھانے کی کوئی چیز نہ تھی، نہ دادا کے لیے، نہ خود اپنے لیے۔ ایک عورت نے جس کی چھاتیوں میں دودھ تھا، اپنا تھوڑا سا دودھ میرے چھوٹے بھائی کو دیا، حالاں کہ اپنے گھر پر تو وہ ہماری طرح دلیہ ہی کھاتا تھا۔ دادی ہمیں اپنے ساتھ لے کر جنگلی ساگ کی تلاش میں نکلی ، لیکن گاؤں کا ہر فرد ہی اس تلاش میں نکلا ہوا تھا، اس لیے ساگ کا ایک پنا بھی کہیں باقی نہ بچا تھا۔

ہمارا داوا چند نوجوانوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ہماری ماں کی تلاش میں نکلا، مگر اسے تلاش نہ کر سکا۔ دادی دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر بین کرنے لگی ، اور میں بھی اس میں شامل ہو گئی۔ کچھ لوگ تھوڑی سی پھلیاں وغیرہ کھانے کے لیے لے آئے ، مگر دو دن بعد پھر وہی فاقہ تھا۔ دادا کے پاس تین بھیڑیں، ایک گاے اور ترکاریوں کا ایک باغیچہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن بھیڑیں اور گاے تو بہت دن ہوے ڈا کو لے گئے تھے ۔ وہ بھی تو آخر کو بھوکے تھے۔ اور جب بوائی کا وقت آیا تو دادا کے پاس بیج ہی نہ تھے۔

آخر ان دونوں نے طے کر ہی لیا ۔ بلکہ طے تو دادی نے کیا؛ دادا لاکھ چیخا چلایا اور ادھر ادھر پیر پٹختا پھرا، لیکن دادی نے ذرا پروا نہ کی ۔ کہ ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔ ہم بچے بہت خوش تھے ۔ ہم ایسی جگہ سے چلے ہی جانا چاہتے تھے جہاں نہ ماں تھی اور نہ کھانا تھا۔ ہم وہاں جانا چاہتے تھے جہاں ڈاکو نہ ہوں اور کھانا ہو۔ ہم یہ سوچ سوچ کر ہی خوش تھے کہ کہیں بہت دور کوئی ایسی جگہ بھی ہے۔

\*\*\*\*

دادی نے اپنی گرجا گھر پہن کر جانے والی پوشاک دے کر بدلے میں کچھ خشک مکئی کے وانے لے لیے اور ان دانوں کو ابال کر ایک پرانے کپڑے میں باندھ لیا، اور جب ہم وہاں سے روا نہ ہوے تو وہ دانے ہمارے پاس تھے۔ دادی کا خیال تھا کہ ہمیں دریا کا پانی مل جائے گا، لیکن ہمیں کوئی دریا دریا نہ ملا۔ ہمیں اتنی سخت پیاس لگی کہ ہمیں واپس مڑنا پڑا۔ لیکن ہم واپس دادی کے گھر نہیں آئے بلکہ ایک ایسے گاؤں میں رک گئے جہاں پانی کا بمبا تھا۔ دادی نے اپنی ٹوکری کھولی جس میں اس نے کپڑے اور مکئی کے دانے ٹھونس رکھے تھے، اور اس بار اپنے جوتے بیچ کر پانی کے لیے ایک بڑا پلاسٹک کا ڈرم خرید لیا۔ میں نے کہا، "گو گو! اب تم بغیر جوتوں کے گرجا گھر کیسے جاؤ گی ؟” لیکن اس نے کہا کہ سفر لمبا ہے اور ہم زیادہ سامان نہیں اٹھا سکتے۔ اس گاؤں میں ہمیں آور لوگ بھی ملے جو اس جگہ کو چھوڑ کر جا ر ہے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ مل گئے کیوں کہ وہ سب ہمارے مقابلے میں اپنی منزل سے زیادہ واقف دکھائی دیتے تھے۔

وہاں پہنچنے کے لیے ہمیں کروگر پارک سے گزرنا تھا۔ ہم کروگر پارک کے بارے میں پہلے سے جانتے تھے ۔ ایک طرح کی پوری کی پوری حیوانوں کی مملکت: با تھی، شیر، گیدڑ، لکڑیکھے، تیندوے، مگر مچھ، غرض ہر قسم کے جانور۔ ان میں سے کچھ تو ہمارے اپنے ملک میں بھی تھے، خاص طور پر لڑائی سے پہلے۔ (ہمارے دادا کو یاد ہے؛ ہم بچے تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوے تھے۔ ) لیکن ڈاکوؤں نے سارے ہا تھیوں کو مار ڈالا تھا اور ان کے دانت بیچ دیے تھے۔ اور ڈاکوؤں نے اور ہمارے سپاہیوں نے سارے ہرن بھی کھا لیے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی دونوں ٹانگوں سے معذور تھا۔ اس کی ٹانگیں ہمارے دریا میں رہنے والے ایک مگر مچھ نے کھا لی تھیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارا ملک انسانوں کا ملک ہے، جانوروں کا نہیں۔ ہمیں کروگر پارک کے متعلق معلوم تھا کیوں کہ ہمارے کچھ لوگ اپنا گھروں سے نکل کر ایسی جگہوں پر کام کرنے جاتے تھے جہاں گورے لوگ جانوروں کو دیکھنے کے لیے آ کر ٹھہرتے تھے۔

ہم نے پھر اپنا سفر شروع کیا۔ قافلے میں کچھ عورتیں تھیں اور کچھ میری طرح کے بچے ۔ جب عورتیں تھک جائیں تو چھوٹے بچے ان کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے تھے۔ ایک آدمی ہمیں کرو گر پارک کی طرف لے کر چلا گیا پارک آ گیا ؟ کیا پارک آ گیا ؟ " میں دادی سے بار بار پوچھ رہی تھی۔ دادی کے جواب نہ دینے پر اس آدمی نے بتایا کہ ابھی نہیں آیا۔ اس نے ہمیں یہ بھی بتا یا کہ باڑھ کے گرد سے گھوم کر جانے میں بہت لمبا راستا طے کرنا ہو گا۔ باڑھ کے بارے میں اس نے یہ بھی کہا کہ اس کو ہاتھ لگاتے ہی تم مر جاؤ گے؛ اس کو چھوتے ہی تمھاری کھال جل بھن کرکباب ہو جائے گی، بالکل اس طرح جیسے شہروں میں بجلی کے کھمبوں کے اوپر تنے ہوے تاروں کو چھونے سے ہوتا ہے۔ میں نے مشن مہسپتال میں ایک لوہے کے ڈبے پر سر کا وہ نشان بنا دیکھا تھا جس پر نہ آنکھیں تھیں نہ کھال اور نہ بال۔ بعد میں یہ ہسپتال بھی دھماکے سے اُڑ گیا۔

جب میں نے اگلی بار وہی سوال کیا تو پتا چلا کہ ہم ایک گھنٹے سے کروگر پارک کے اندر ہی تو چل رہے ہیں۔ مگر وہ تو دیکھنے میں انھیں جھاڑیوں کی طرح لگتا تھا جن میں ہم پورے دن چلتے رہے تھے۔ اور ہمیں کوئی جانور بھی دکھائی نہیں دیا، بس بندر اور چڑیاں جو ہمارے گھر کے آس پاس بھی ہوتی تھیں ، اور ایک کچھوا جو بھاگ کر ہم سے دور نہیں جا سکا۔ میرا بڑا بھائی اور دوسرے لڑکے کچھوے کو اس آدمی کے پاس لے گئے تا کہ اسے مار کر پکایا اور کھا یا جاسکے ۔ اس نے کچھوے کو چھوڑ دیا کیوں کہ اس کا کہنا تھا کہ وہاں آگ نہیں جلائی جا سکتی۔ جب تک ہم پارک میں تھے، آگ نہیں جلا سکتے تھے، ورنہ دھویں سے ہمارا پتا چل جاتا اور پولیس اور پہرے دار آکر ہمیں واپس وہیں بھیج دیتے جہاں سے ہم چلے تھے۔ اس آدمی نے کہا کہ ہمیں جانوروں کے درمیان جانوروں کی طرح چلنا ہو گا، یعنی سڑک اور گورے لوگوں کے خیموں سے دور دور۔ اسی لمحے مجھے ایک آواز سنائی دی ۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آواز سب سے پہلے میں نے ہی سنی ۔ جیسے ٹہنیاں چٹخ رہی ہوں اور کوئی گھاس کو روند تا چلا آ رہا ہو۔ اور میری قریب قریب چیخ نکل گئی کیوں کہ میں نے سوچا کہ شاید پولیس اور پھرے دار ہوں ۔ جن سے وہ آدمی ہمیں چوکنا رہنے کو کہہ رہا تھا ۔ اور انھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہو۔ مگر وہ تو ہاتھی نکلا۔ اس کے پیچھے دوسرا ہاتھی ، اور اس کے پیچھے بہت سارے ہا تھی جیسے بڑے بڑے کالے دھبے پیڑوں کے درمیان ہر طرف چل پھر رہے ہوں ۔ وہ اپنی سونڈوں میں موپین درخت کی لال پٹیوں کو لپیٹ کر اپنے منہ میں ٹھونس رہے تھے۔ ہاتھیوں کے بچے اپنی ماؤں سے چمٹے ہوے چل رہے تھے۔ کچھ بڑے بچے آپس میں اس طرح دھینگا مشتی کر رہے تھے جیسے میرا بڑا بھائی اور اس کا دوست ۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ ہاتھوں کے بجاے سونڈوں سے لڑر ہے تھے۔ مجھے اتنا مزہ آ رہا تھا کہ ڈرنا یاد تک نہ رہا۔ اس آدمی نے کہا کہ جب تک ہاتھی گزر نہیں جاتے ہم خاموش، دم سادھے کھڑے رہیں۔ مگر ہاتھی آہستہ آہستہ، مزے مزے سے گزر رہے تھے، کیوں کہ ہاتھی اتنے لحیم شحیم ہوتے ہیں کہ ان کو کسی سے ڈر کر بھاگنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ہرن ہم سے ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگتے تھے۔ وہ ہوا میں اتنی اونچی قلانچیں بھر تے ما نواڑر ہے ہوں۔ جنگلی سور ہماری آہٹ سنتے ہی بالکل ساکت ہو گئے، اور پھر یوں لہریے بناتے ہوے بھاگے جیسے ہمارے گاؤں میں ایک لڑکا اپنی سائیکل چلاتا تھا جو اس کے باپ نے اسے لا کر دی تھی۔ ہم جانوروں کے پیچھے پیچھے ان کی پانی پینے کی جگہ تک جاتے، اور جانوروں کے جانے کے بعد قریب جا کر پانی پیتے۔ ہمیں کبھی پیاسا نہیں رہنا پڑا، لیکن جانور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے ہی رہتے تھے۔ جب دیکھو کبھی گھاس پھوس، کبھی پیڑ پودے، کبھی پیڑوں کی جڑیں اور چھال کھا رہے ہوتے۔ اور ادھر ہمارے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ مکئی کے دانے بھی ختم ہو چکے تھے۔ اگر ہمارے کھانے کو کچھ تھا تو وہ لنگوروں کی غذا تھی، یعنی چھوٹے چھوٹے، اور چیونٹیوں سے بھرے انجیر جو دریا کے کنارے پیڑوں کی شاخوں پر لٹکے ہوے تھے۔ سچ مچ جانوروں کی طرح ہونا بہت مشکل تھا۔

دن میں جب بہت زیادہ گرمی ہوتی تو شیر ہمیں سوتے ہوے ملتے۔ ان کا رنگ گھاس کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ پہلے پہل ہمیں تو وہ دکھائی ہی نہ دیے، مگر لیکن اس آدمی کو نظر آ گئے اور وہ ہمیں اس جگہ سے بہت دور جہاں شیر سور ہے تھے، الٹی طرف واپس لے گیا۔ میرا بھی شیروں کی طرح سونے کو بہت جی چاہتا تھا۔ میرا بھائی برا بر د ُبلا ہورہا تھا لیکن بھاری ویسا ہی تھا، اور جب دادی میرے بھائی کو میری پیٹھ پر لادنے کے لیے میری طرف دیکھتی تو میں کوشش کرتی کہ اس کی طرف نہ دیکھوں۔ میرے بڑے بھائی نے بھی بولنا بند کر دیا تھا اور جب ہم آرام کے لیے لیٹتے تو اسےہلا ہلا کر جگانا پڑتا، جیسے دادا کی طرح اسے بھی کچھ سنائی نہ دیتا ہو۔ میں نے دادی کے منہ پر مکھیاں رینگتی ہوئی دیکھیں جنھیں وہ اڑا نہیں رہی تھی۔ مجھے بہت ڈر لگا۔ میں نے پام کی ایک شاخ لے کر ان کو اڑا یا۔

ہم دن کے وقت بھی چلتے اور رات کو بھی۔ اب ہمیں گورے لوگوں کے خیمے دکھائی دینے لگے تھے جہاں آگ جل رہی تھی اور کھانا بھی پک رہا تھا، اور ہمیں دھویں اور گوشت دونوں کی خوشبو آرہی تھی۔ ہم نے لکڑ بگھوں کو اس خوشبو کے پیچھے جھاڑیوں میں سے بھاگتے ہوے دیکھا؛ ان کی کمریں اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے وہ کسی بات پر شرمندہ ہوں۔ جب کوئی لکڑ بگھا اپنی گردن موڑتا تو اس کی آنکھیں ایسی ہی لگتیں جیسی ہماری آنکھیں رات کے اندھیرے میں ایک دوسرے کو دیکھتی ہوئی لگتی ہیں۔ ہوا کے ساتھ ساتھ باڑھ سے گھرے ہوے احاطوں میں سے ہماری زبان میں بول چال کی آوازیں آرہی تھیں؛ وہاں کیمپوں میں کام کرنے والے رہتے تھے۔ رات کے وقت ہم میں سے ایک عورت مدد مانگنے ان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ہمیں کچرے کے ڈرم میں سے بھی کھانے کی کوئی چیز دے سکتے ہیں۔ آخر اس نے رونا شروع کر دیا اور دادی کو اسے سنبھالنا بھی پڑا اور اس کا منہ اپنے ہاتھ سے بند بھی کرنا پڑا۔ اس آدمی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں کروگر پارک میں کام کرنے والے اپنے لوگوں سے دور دور رہنا ہو گا اگر وہ ہماری مدد کرتے تو اپنی نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ اگر ان کی نظر ہم پر پڑ جاتی تو وہ بس اتنا کر سکتے تھے کہ ظاہر کریں کہ ہم وہاں ہیں ہی نہیں ؛ انھوں نے خالی جا نور دیکھے تھے۔

کبھی کبھی رات کو ہم سونے کے لیے تھوڑی دیر کو رک جاتے۔ ہم ایک دوسرے سے سٹ کر سوئے تھے۔ مجھے پتا نہیں وہ کون سی رات تھی ۔ کیوں کہ ہم ہر وقت چلتے ہی چلے جا رہے تھے ۔ جب ہم نے کہیں بہت قریب ہی شیروں کی آواز سنی۔ ایسی آواز نہیں جیسی شیر دور سے دہاڑ رہے ہوں ، بلکہ کچھ اس طرح جیسے سانس پھولنے کی آواز ہوتی ہے۔ بالکل ویسی جیسی دوڑنے کے بعد ہماری نکلتی ہے۔ لیکن یہ ہانپنے کی آواز کچھ مختلف تھی کیوں کہ وہ دوڑ نہیں رہے تھے، کہیں نزدیک ہی کسی انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم کھسک کر ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے؛ جو کناروں پر تھے ان کی کوشش تھی کہ اندر گھس کر درمیان میں پہنچ جائیں۔ میں بالکل ایک عورت سے لگ کر کھڑی تھی جس کی بدن سے بدبو آ رہی تھی کیوں کہ وہ ڈر رہی تھی، لیکن میں خوشی سے اس سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے خدا سے دعا مانگی کہ شہر کنارے پر کھڑے کسی ایک کو لے لیں اور یہاں سے چلے جائیں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تا کہ اس درخت کو نہ دیکھوں جہاں سے کوئی شیر کود کر ہمارے درمیان آ سکتا تھا، بالکل بیچ میں جہاں میں کھڑی تھی۔ لیکن وہ آدمی اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور ایک سوکھی ٹہنی پیڑ پر زور زور سے مارنے لگا۔ ہم سے تو اس نے کوئی آواز نہ نکالنے کو کہا تھا اور خود چیخ رہا تھا۔ وہ شیروں پر ایسے چیخ رہا تھا جیسے ہمارے گاؤں میں ایک اشیارا یوں ہی ہوا میں منعہ اٹھا کر چیختا رہتا تھا۔ شیر چلے گئے۔ ہم نے دور سے ان کے دہاڑ نے اور چیخنے کی آوازیں سنیں۔

ہم تھک گئے تھے، بہت زیادہ تھک گئے تھے۔ جب راستے میں ہم کوئی دریا پار کرتے تو میرے بڑے بھائی اور ایک اور آدمی کو میرے دادا کو اٹھا کر ایک پتھر سے دوسرے پتھر تک لے جانا پڑتا۔ میری دادی بہت طاقت ور ہے لیکن اس کے پیروں سے خون بہہ رہا تھا۔ ہم اتنےتھک گئے تھے کہ سر پر ٹوکری بھی اٹھا کر نہیں چل سکتے تھے، تم کچھ بھی نہیں اٹھا سکتے تھے، سواے میرے چھوٹے بھائی کے۔ ہم نے اپنی ساری چیزیں ایک جھاڑی کے نیچے چھوڑ دیں۔ ہم خود ہی وہاں پہنچ جائیں تو بہت ہے، دادی نے کہا۔ پھر ہم نے بھوک کے مارے کچھ جنگلی پھل کھا لیے جو ہمارے گھر کے آس پاس نہیں ہوتے تھے، اور اس سے ہم سب کے پیٹ خراب ہو گئے اور دست آنے لگے۔ اُس وقت ہم ایسی گھاس میں سے گزر رہے تھے جو ہا تھی گھاس کہلاتی تھی اور تھی بھی ہاتھی جتنی او نہی۔ تب ہمارے پیٹوں میں مروڑ شروع ہوئی، اور ہمارا دادا تو میرے چھوٹے بھائی کی طرح سب کے سامنے بیٹھ کر فارغ بھی نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے وہ فارغ ہونے اکیلا ہی گھاس کے اندر چلا گیا۔ چلتے رہو، چلتے رہو، وہ آدمی ہم سے برا برکھتا رہتا تھا، لیکن ہم نے اس سے دادا کے لیے انتظار کرنے کو کہا۔

اب ہر شخص دادا کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا، لیکن وہ اب آیا نہ جب۔ دو پہر کا وقت تھا؛ ہمارے کانوں میں کیڑے مکوڑوں کے بھنبھنانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ہم گھاس کی سرسراہٹ نہیں سن سکتے تھے جس سے پتا چلتا کہ وہ واپس آ رہا ہے۔ ہم اسے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے کیوں کہ گھاس بہت اونچی تھی اور دادا بہت چھوٹا۔ لیکن ہمیں یقین تھا کہ وہ اپنے ڈھیلے پتلون اور پھٹی ہوئی قمیص میں یہیں کہیں ہو گا! ہماری دادی اس کی قمیص سی نہیں سکی تھی کیوں کہ دھاگا نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا کیوں کہ وہ کمزور تھا اور آہستہ چلتا تھا۔ ہم اس کی تلاش میں نکلے، لیکن چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تاکہ گھاس میں کہیں ہم بھی ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ گھاس ہماری ناک اور آنکھوں میں گھسی جارہی تھی۔ ہم دبی دبی آواز میں دادا کو پکار رہے تھے، لیکن اس کے کانوں میں جو جگہ سماعت کے لیے بچی تھی وہ شاید کیڑے مکوڑوں کی بھنبھناہٹ نے پر کر دی تھی۔ ہم اسے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک گئے لیکن وہ نہ ملا۔ ہم پوری رات اس اونچی گھاس میں پڑے رہے۔ نیند میں میں نے اسے ایک جگہ گڑمڑی مارے پڑا دیکھا جو اس نے خود کھودی تھی جیسے ہر نیاں اپنے بچوں کو چھپانے کے لیے کھودتی ہیں۔

جب میری آنکھ کھلی تب بھی اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہم نے پھر اس کی تلاش شروع کی۔ ہم نے گھاس پر چل چل کر ایسے راستے بنا دیے تھے کہ اگر ہم اسے نہیں ڈھونڈھ سکتے تھے تو وہ آسانی سے ہمیں تلاش کر سکتا تھا۔ اس پورے دن ہم بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہے۔ جب سورج سر پر ہو تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس کی شعاعیں سر میں گھسی جاتی ہیں ، چاہے تم جا نوروں کی طرح پیڑ کے نیچے لیٹے ہوے ہو۔ میں چت لیٹی مڑی ہوئی چونچوں اور پر نچی گردنوں والے ان بد صورت پرندوں کو دیکھ رہی تھی جو ہمارے اوپر چاروں طرف اڑ رہے تھے۔ ہم انھیں اُس وقت بھی دیکھتے ہوے گزرے تھے جب وہ مردہ جانوروں کی ہڈیاں کرید رہے تھے، اور ان ہڈیوں میں ہمارے کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ اوپر گول گول چکر لگا رہے تھے، کبھی نیچے آ کر اڑنے لگتے اور کبھی اوپر چلے جاتے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی گردنیں کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف مڑ جاتیں ۔ وہ اڑتے ہوے مسلسل چکر لگا ر ہے تھے۔ میں نے دادی کو دیکھا؛ وہ میرے چھوٹے بھائی کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور وہ بھی ان پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔

شام کے وقت وہ آدمی دادی کے پاس آیا اور اس سے کھنے لگا کہ باقی لوگوں کو اب روا نہ ہو جانا چاہیے۔ اس نے کہا کہ اگر ان کے بچوں کو کھانے کو کچھ نہ ملا تو وہ بہت جلد مرجائیں گے۔

دادی کچھ نہ بولی۔

میں جانے سے پہلے تھیں کچھ پانی لادوں گا ، ” وہ آدمی بولا۔

دادی نے میری طرف، میرے بڑے بھائی کی طرف اور اپنی گود میں لیٹے ہوے میرے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔ ہم دوسرے لوگوں کو جانے کے لیے کھڑے ہوتے دیکھ رہے تھے۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ہمارے ارد گرد کی وہ گھاس جہاں سب لوگ تھے، خالی ہو جائے گی۔ ہم اس جگہ یعنی کروگر پارک میں اکیلے رہ جائیں گے اور پھر پولیس یا درندے ہمارا کھوج لگالیں گے۔ آنسو میری آنکھوں سے بہہ بہہ کر ناک سے میرے ہاتھوں پر ٹپکنے لگے لیکن دادی نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اٹھی اور اپنی ٹانگیں یوں پھیلا لیں جیسے جلانے والی لکڑیاں اٹھاتے وقت پھیلاتی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ میرے بھائی کو اپنی پیٹھ پر لادا اور ایک کپڑے سے اسے اپنے اوپر کس کر باندھ لیا۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور اس کی بڑی بڑی چھاتیاں ، جن میں میرے بھائی کے لیے کچھ بھی نہ تھا، نظر آرہی تھیں ۔ اس نے کہا، "چلو۔"

تب ہم او نچی گھاس والی جگہ کو چھوڑ کر آگے چل دیے۔ وہ جگہ پیچھے رہ گئی۔ ہم اس آدمی اور باقی سب لوگوں کے ساتھ چل پڑے۔ ہم دوبارہ چلنے لگے۔

ایک بڑا سا خیمہ ہے ۔ کسی گرجاگھر یا اسکول سے بھی بڑا ۔ جو زمین میں گڑا ہوا ہے۔ جب ہم بہت چلنے کے بعد یہاں پہنچے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ وہ جگہ ہو گی۔ اس قسم کی جگہ ہم نے اس وقت بھی دیکھی تھی جب ہماری ماں ہمیں ساتھ لے کر شہر گئی تھی کیونکہ اس نے سنا تھا کہ ہمارے فوجی وہاں آئے ہوے ہیں، اور وہ ان سے ہمارے باپ کا اتا پتا پوچھنا چاہتی تھی۔ اُس جیسے میں لوگ دعا مانگ رہے تھے اور گار ہے تھے۔ یہ خیمہ بھی اُسی خیمے کی طرح نیلا اور سفید ہے لیکن یہ دعا مانگنے یا گانے کے لیے نہیں ہے۔ ہم یہاں ان دوسرے لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں جو ہمارے ملک سے آئے ہیں۔ مطلب کی نرس کہتی ہے کہ چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر ہم کل دو سو افراد ہیں۔ کچھ نئے پیدا ہونے والے بچے بھی ہیں جو اس وقت پیدا ہوے جب تم کروگر پارک میں سے گزر رہے تھے۔

دن کے وقت بھی جب سورج چمک رہا ہوتا ہے، خیمے کے اندر اندھیرا رہتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پورا گاؤں یہیں آ بسا ہو۔ اندر مکانوں کے بجاے ہر خاندان نے اپنے رہنے کی جگہ کو بوریوں یا گنے کے بکسوں سے ۔ جو کچھ بھی ہاتھ لگے ۔ گھیر لیا ہے تا کہ دوسرے خاندان کو جتا سکیں کہ یہ ان کی جگہ ہے اور اس جگہ میں کوئی اور داخل نہ ہو۔ حالاں کہ یہاں نہ کوئی دروازہ ہے نہ کھڑکی، اور نہ کوئی چھپر ، اور کوئی بڑا اگر کھڑا ہو کر دیکھے تو ہر ایک کے گھر کے اندر جھانک سکتاہے۔ کچھ لوگوں نے تو پتھروں کو پیس کر رنگ بھی گھول لیا اور بوریوں پر تصویریں بنالیں۔

ویسے چھت آءِ یہاں ضرور ہے ۔ اوپر، بہت دور ، خیمے کا سائبان ۔ بالکل آسمان کی طرح۔ کسی بڑے سے پہاڑ کی طرح جس کے اندر ہم رہ رہے ہوں۔ خیمے کی دراروں میں سے گرد کے راستے سے نیچے کی طرف آتے دکھائی دیتے ہیں ، جو اتنے چوڑے ہیں کہ لگتا ہے ہم ان پر چڑھ سکتے ہیں۔ خیمے کی چھت اوپر سے بارش کے پانی کو اوپر سے آنے سے تو روک لیتی ہے لیکن پانی نیچے سے بہہ بہہ کر اندر آ جاتا ہے اور ہمارے اپنے بنائے ہوے مکانوں کی گلیوں میں پھیل جاتا ہے ۔ یہ گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ ان میں ایک وقت میں ایک ہی آدمی چل کر جا سکتا ہے ۔ اور چھوٹے بچے، جیسے میرا چھوٹا بھائی ہے، کیچڑ میں کھیلنے لگتے ہیں۔ تب ان بچوں پر سے پھلانگ کر ہی گزرا جا سکتا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی نہیں کھیلتا۔ دادی اسے ہر سوموار کو، جب ڈاکٹر آتا ہے، مطلب لے جاتی ہے۔ نرس بتاتی ہے کہ اس کے سر میں کچھ خرابی ہے؛ اس کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جہاں سے آئے ہیں وہاں ہمیں کم خوراک ملتی تھی۔ جنگ کی وجہ سے۔ یا شاید اس وجہ سے کہ ہمارا باپ وہاں نہیں تھا۔ یا پھر شاید اس وجہ سے کہ وہ گرو گر پارک سے گزرنے کے پورے وقت بھوکا رہا تھا۔ اسے تو بس دن بھر دادی کے پیٹ پر یا گود میں پڑے رہنا، یا اس سے ٹیک لگائے بیٹھے رہنا ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ وہاں سے ہمیں تکتا رہتا ہے۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے مگر اس سے بولا نہیں جاتا۔ جب میں اس کے گدگدی کرتی ہوں تو وہ صرف مسکرا دیتا ہے۔ مطب سے اسے کھلانے کے لیے ایک سفوف ملا جسے گھول کر اس کے لیے دلیہ بنا یا جاتا ہے، اور شاید ایک دن وہ ٹھیک ہو جائے۔

جب ہم یہاں پہنچے تب ہماری ۔ میری اور میرے بڑے بھائی کی ۔ حالت بھی بالکل اسی کی طرح تھی۔ مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں آتا۔ خیمے کے پاس گاؤں میں رہنے والے لوگ ہمیں مطب میں لے گئے تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد وہیں جا کر اپنا نام لکھوانا پڑتا ہے ۔ کہ ہم وہاں سے نکل آئے ہیں، کروگر پارک کے راستے۔ ہم گھاس پر بیٹھ گئے اور ہر چیز گڈمڈ ہوتی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایک نرس جو اپنی سید ھے بنے ہوے بالوں اور اونچی ایڑھی کے خوب صورت سینڈلوں کی وجہ سے بہت پیاری لگ رہی تھی، ہمارے لیے یہی خاص سفوف لے کر آئی اور بتایا کہ ہم یہ سفوف پانی میں گھول کر آہستہ آہستہ پیئیں۔ ہم نے پیکٹ کو دانتوں سے پھاڑا اور سفوف کو منہ میں ڈال لیا۔ سفوف منھ کے اندر چپک گیا۔ میں نے ہونٹوں اور انگلیوں پر لگے ہوے سفوف کو چوس لیا۔ کچھ دوسرے بچے جو ہمارے ساتھ ہی آئے تھے، الٹیاں کرنے لگے۔ مجھے بھی اپنے پیٹ اندر کچھ حرکت سی محسوس ہوئی۔ سفوف سانپ کی طرح رینگتا ہوا اندر جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ہچکیاں آنا شروع ہوئیں جن سے میرا برا حال ہو گیا۔ دوسری نرس نے ہمیں مطب کے بر آمدے میں قطار بنا کر کھڑے ہونے کو کہا مگر ہم کھڑے نہ ہو سکے۔ ہم وہاں ادھر ادھر ایک دوسرے پر گرے ہوے بیٹھے تھے۔ نرسوں نے ہر ایک کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور بازو میں سوئیاں لگائیں۔ دوسری سوئیوں سے ہمارا خون لے کر چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں ڈالا۔ یہ سب بیماری کی روک تھام کے لیے کیا جا رہا تھا، مگر میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب بھی میری آنکھ لگتی مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ میں لمبی گھاس میں بس چلے ہی جا رہی ہوں۔ مجھے ہاتھی بھی دکھائی دیتے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہم پہنچ گئے ہیں۔

لیکن دادی اب بھی طاقت ور تھی، وہ کھڑی بھی ہو سکتی تھی اور اسے لکھنا بھی آتا تھا، اس لیے اس نے ہمارے لیے بھی دستخط کیے۔ ہماری دادی نے خیمے کی ایک دیوار کے بالکل ساتھ یہ جگہ لی؛ یہ خیمے میں بہترین جگہ ہے۔ یہاں بارش کا پانی تو بے شک اندر آتا ہے مگر جب موسم اچھا ہو تو ہم پردہ اٹھا سکتے ہیں اور سورج ہمارے سامنے ہوتا ہے اور سیلن کی بد بو جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ دادی یہاں ایک عورت کو جانتی ہے جس نے اسے بتایا کہ سونے کی چٹائی بنانے کے لیے عمدہ گھاس کہاں سے لی جائے، اور دادی نے ہمارے لیے چٹائیاں بنا دیں۔ مہینے میں ایک بار کھانے کی چیزوں سے بھرا ہوا ٹرک مطب میں آتا ہے۔ دادی اپنا دستخط کیا ہوا کارڈ لے کر وہاں جاتی ہے، اور اس کے کارڈ میں چھید ہونے کے بعد ہمیں مکئی کے دانوں کی ایک بوری مل جاتی ہے۔ بوریوں کو خیمے تک لانے کے لیے وہاں ایک پیسے والی ریڑھیاں ہیں؛ میرا بڑا بھائی بوری اس پر رکھ کر لے آتا ہے۔ واپسی میں وہ اور دوسرے لڑکے خالی ریڑھیوں کو دھکیلتے ہوے مطب کی طرف دوڑ لگائے ہیں۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے اسے کوئی ایسا شخص مل جاتا ہے جس نے گاؤں سے بیئر کی بوتلیں خریدی ہوں ، اور اسے ان بوتلوں کو پہنچانے کے کچھ پیسے مل جاتے ہیں ۔ ویسے اس کی اجازت نہیں ہے، ریڑھیوں کو سیدھا نرسوں کے پاس واپس پہنچانا ہوتا ہے۔ میرا بھائی ان پیسوں سے شربت خریدتا ہے اور میرے مانگنے پر تھوڑ اسا شر بت مجھے بھی دے دیتا ہے۔ مہینے میں ایک اور دن گرجاگھر سے کپڑوں کا ایک گٹھر مطب کے صحن میں آتا ہے۔ دادی کے پاس ایک اور کارڈ ہے جس میں چھید کروانے کے بعد ہم وہاں سے اپنی پسند کا کوئی لباس لے سکتے ہیں : میرے پاس دو جوڑے ، دو پتلون اور ایک جرسی ہو گئی ہے، اور اب میں اسکول جا سکتی ہوں۔

گاؤں والوں نے ہمیں اپنے اسکول میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ہماری ہی زبان بولتے ہیں۔ دادی کہتی ہیں شاید اسی وجہ سے انھوں نے ہمیں اپنے علاقے میں رہنے دیا ہے۔ بہت دن پہلے، ہمارے آباواجداد کے وقتوں میں، ایسی کوئی باڑھ نہیں تھی جس کو چھونے سے لوگ مر جاتے ہیں ، نہ اُن کے اور ہمارے درمیان کوئی کروگر پارک تھا۔ ہم سب ایک تھے، اپنے گاؤں سے لے کر یہاں تک، جہاں ہم اب آ گئے ہیں ، اور ہمارا ایک ہی بادشاہ تھا۔

ہمیں اس خیمے میں رہتے رہتے بہت دن ہو گئے ہیں ۔ اب میں گیارہ سال کی ہوں اور میرا چھوٹا بھائی لگ بھگ تین سال کا ، حالانکہ وہ بہت چھوٹا سا ہے، صرف اس کا سر بہت بڑا ہے۔ وہ ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ اب کچھ لوگوں نے خیمے کے ارد گرد کی خالی زمین کو کھود کر وہاں مکئی اور کرم کلابو دیا ہے۔ بوڑھے لو گوں نے شاخیں جوڑ جوڑ کر اپنی کیاریوں کے گرد ہاڑھیں لگالی ہیں۔ کسی کو شہر میں جا کر کام کرنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن کچھ عور توں نے گاؤں ہی میں کام تلاش کر لیا ہے اور اب وہ کچھ خریداری بھی کر سکتی ہیں۔ دادی اب بھی طاقت ور ہے، اس لیے وہ بھی ایسی جگہ جہاں لوگ مکان بنا ر ہے ہوں، کام ڈھونڈھ لیتی ہے ۔ اس گاؤں میں لوگ اینٹوں اور سیمنٹ سے بہت خوب صورت مکان بناتے ہیں، ہمارے گاؤں کی طرح مٹی اور گارے سے نہیں۔ دادی لوگوں کے لیے اینٹیں اور پتھروں کی ٹوکریاں سر پر ڈھو کر لے جاتی ہے۔ اب اس کے پاس شکر، چاے، دودھ اور صابن تک خرید نے کے پیسے ہوتے ہیں۔ اسٹور والوں نے اسے ایک کیلنڈر بھی دیا جو اس نے خیمے میں ہمارے پاس کے پردے پر ٹانگ دیا ہے۔ میں اسکول میں بہت تیز ہوں اور اس نے لوگوں کے پھینکے ہوئے اشتہاروں کے صفحے جمع کر کے میری کتابوں پر چڑھا دیے ہیں۔ وہ ہر سہ پہر کو مجھے اور بڑے بھائی کو اسکول کا کام پورا کرنے کے لیے بٹھا دیتی ہے، اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جائے، کیوں کہ یہاں خیمے میں صرف سٹ کر لیٹنے بھر کی جگہ ہے، جیسے ہم کروگر پارک سے گزرتے ہوے لیٹا کرتے تھے، اور موم بتیاں بہت مہنگی ہیں۔ دادی ابھی تک اپنے لیے جوتے نہیں خرید سکی جنہیں پہن کر گرجا گھر جا سکے لیکن اس نے میرے اور بڑے بھائی کے لیے اسکول کے کالے جوتے اور ان پر کرنے کے لیے پالش خرید لی ہے۔ ہر صبح جب خیمے میں لوگ بیدار ہور ہے ہوتے ہیں، بچے روتے چلاتے ہیں، لوگ باہر لگے نکلے پر ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں اور کچھ بچے پتیلیوں میں سے رات کا بچا ہوا دلیہ کھرچ کھرچ کر کھا رہے ہوتے ہیں ، میں اور میرا بڑا بھائی اپنے جوتے پالش کرتے ہیں۔ دادی ہمیں ٹانگیں سیدھی کر کے چٹائی پر بٹھا دیتی ہے اور ہمارے جوتوں کا غور سے معائنہ کرتی ہے کہ ہم نے ٹھیک پالش کیے ہیں یا نہیں۔ خیمے میں اور کسی بھی بچے کے پاس اسکول کے سچ مچ کے جوتے نہیں ہیں۔ جب ہم تینوں ان جوتوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے ہم اپنے گھر میں ہیں ، کہیں بھی جنگ نہیں ہورہی ہے اور نہ ہم کہیں اور گئے ہیں۔

کچھ گورے لوگ خیمے میں رہنے والے ہمارے لوگوں کی تصویر یں اتارنے آئے ۔ وہ کھتے تھے کہ وہ فلم بنا رہے ہیں۔ میں نے کبھی فلم نہیں دیکھی حالاں کہ میں اس کے بارے میں جانتی ہوں۔ ایک گوری عورت ہماری جگہ میں گھس آئی اور دادی سے سوال کرنے لگی جو ایک آدمی ، جو اس عورت کی زبان سمجھتا تھا، ہماری زبان میں دہراتا۔

" تم یہاں کب سے اس طرح رہ رہی ہو ؟“

کیا مطلب؟ یہاں ؟ " دادی نے کہا۔ " اس جیسے میں ؟ دو سال اور ایک ماہ سے۔

" اور مستقبل کے بارے میں تمھاری کیا امید میں ہیں ؟“

کچھ بھی نہیں۔ میں بس یہیں ہوں۔

" لیکن تمھارے بچے؟"

میں چاہتی ہوں وہ پڑھ لکھ جائیں تا کہ انہیں اچھی نوکری اور اچھے پیسے مل سکیں۔"

" کیا تمھیں امید ہے کہ تم اپنے ملک واپس جا سکو گی ؟“

میں واپس نہیں جاؤں گی۔

" لیکن آخر جب جنگ ختم ہو جائے گی تب تو تمھیں یہاں رہنے کی اجازت نہ ہو گی۔ کیا تم اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتیں ؟ "

میرا خیال تھا اب دادی کچھ اور نہیں بولنا چاہتی۔ میرا خیال تھا وہ گوری عورت کے سوال کا جواب نہیں دے گی۔ گوری عورت نے اپنی گردن موڑ کر ہماری طرف دیکھا اور مسکرائی۔

دادی نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور بولی، اب کچھ نہیں ہے۔ کوئی گھر نہیں۔"

دادی نے ایسا کیوں کیا ؟ آخر کیوں ؟ میں تو واپس جاؤں گی۔ میں اسی کروگر پارک سے گزر کر واپس جاؤں گی۔ جنگ کے بعد ، اگر سب ڈاکوؤں کا صفایا ہو گیا، تو شاید ہماری ماں وہاں ہمارا انتظار کر رہی ہو۔ اور شاید ہمارے دادا نے، جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے ، راستا ڈھونڈھ لیا ہو، اور شاید وہ آہستہ آہستہ کروگر پارک سے ہوتا ہوا گھر واپس پہنچ گیا ہو! وہ سب گھر میں ہوں گے، اور میں انھیں یادرکھوں گی۔

عامر حسین (Aamer Hussein)

انگریزی کے افسانہ نگار عامر حسین ۱۹۵۵ میں کراچی میں پیدا ہوے اور ان کی پرورش پاکستان اور ہندوستان میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی تعلیم لندن کے اسکول آف اوریئنٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز سے تاریخ میں ایم اے کی ڈگری لے کر مکمل کی۔ وہ اب لندن میں مقیم ہیں اور اسی تعلیمی ادارے سے جزوقتی طور پر وابستہ ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۸۷ میں ہوا اور تب سے وہ متعدد جریدوں اور حوالے کی کتابوں کے لیے تنقیدی مضامین اور تبصرے تحریر کر چکے ہیں۔ ان کی کہانیاں مختلف انتخابات میں شامل ہو چکی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ Mirror to the Sun کے عنوان سے ۱۹۹۳ میں شائع ہوا۔

ان کی جس کہانی کا ترجمہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، وہ اسی مجموعے میں Little Tales کے عنوان سے شامل ہے۔

عامر حسین

انگریزی سے ترجمعہ فہمیدہ ریاض

چھوٹی چھوٹی کہانیاں

دیوار یں چنبیلی کی بیلوں سے ڈھکی پڑی تھیں اور باغیچے میں فرنجی پانی کے جھاڑا ُگے تھے۔ صحن میں ایک بادام کا پیڑ تھا اور ہماری گلی میں امرودوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے۔ کبھی کبھی ہم دیوار پھلانگ کر پڑوس کے گھر میں پھل چرا نے یہ سوچ کر پہنچ جاتے کہ بڑی بی تو سورہی ہوں گی۔ ہفتوں تک ہمیں یہی خیال رہا کہ ہمارے ڈاکے کا کسی کو بھی پتا نہیں چل سکا ۔ اور پھر ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ وہ تنکوں کی ٹوکری لیے چلی آ رہی ہیں اچار ڈالنے کے لیے کیریوں کی فرمائش کرتی۔ پھر ہماری مہمات کا مزہ جاتا رہا۔

چنبیلی میں گرگٹ رینگتے، مگر ان کو گُل مہر اور بادام کے درخت پسند نہیں تھے۔ ہم ان کے پیچھے غلیل لیے پھرتے؛ بولتے وقت منہ کھولنے پر ہاتھوں سے دانت چھپاتے۔ بوڑھے ابراہیم نے ہمیں بتا دیا تھا کہ اگر گر گٹوں نے ہمارے دانت گن لیے تو ایکوایک دانت جھڑ جائے گا۔گرگٹوں کے بارے میں ایک اور کہانی بھی تھی ۔ انھوں ہی نے دشمنوں کو رسول اللہ کے چھپنے کی جگہ بتائی تھی ، اور اب ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ میاں کا عذاب نازل ہو چکا تھا، اور ہم انھیں ماریں تو کوئی حرج نہ تھا۔

مارنا تو ہم ترکن کے بلے کو چاہتے تھے مگر ان ہزاروں بلوں اور بلیوں میں جنھیں ابراہیم پال رہا تھا، پنکی اسے سب سے پیارا تھا۔ ابراہیم کو سڑکوں پر آوارہ گھومنے والوں کی سر پرستی کا خبط تھا۔ اس کے باورچی خانے سے فقیروں کو ٹکڑے میسر آجاتے، اُسے گھونسلوں سے گرے ہوے پرندوں کے ننھے منے بچے اور گھروں سے بھاگے ہوے چوزے مل جاتے۔ ایک بار تو اسے ایک مور تک مل گیا تھا۔ اور بلیاں ! ان کا تو وہ شہنشاہ تھا۔ وہ مچھلیوں کے سروں سے ان کی تواضع کیا کرتا اور بلیاں اس کے لیے تین مختلف قسم کے راگ الاپتیں : ایک بھوک کا، ایک دعوت کا اور ایک جشن منانے کا راگ۔ یہ جنگلی بلے ہم سے دور ہی رہتے اور صرف باورچی خانے کی سیڑھیوں تک آتے۔ مگر پنکی کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ ایک بڑا وحشی نَر تھا، بالکل جنگلی بلا۔ وہ دوسرے جنگلی بلوں سے دور رہتا، بجز اس وقت کے جب ان سے بھڑ رہا ہوتا۔ تُرکن کو وہ جب ملا تو اون کا ایک گولا تھا۔ ترکن نے اسے پالا پوسا اور صرف وہی اسے قابو بھی کر سکتی تھی۔ لیکن چاروں طرف تباہی مچاتے اور ہراس پھیلاتے ہوے حملہ کرنے کا شوق اسے ہمارے اور پڑوس کے فلیٹ پر ہی تھا۔ جب ابراہیم پہلے پہل ۔ خود بھی نیم وحشی اور نیم پاگل ۔ سر چھپانے کی جگہ اور ملازمت کی تلاش میں ہماری گلی میں آیا تھا اور ہم نے اسے باورچی رکھ لیا تھا، تو چند ہی ہفتوں میں وہ پنکی کا دوسرا مالک بن بیٹھا تھا ، چونکہ شاید دونوں ہی بے سدھائی مخلوق تھے۔

جہاں تک میری یادداشت کا گزر ہے، ہم اسی فلیٹ میں رہتے آئے تھے، حالانکہ ابا ہمیں ان دنوں کی باتیں سنایا کرتے تھے جب وہ اور امی کراچی میں پناہ گیر بن کر وارد ہوے تھے۔ تب وہ مضافات کی گندی بستیوں میں رہتے تھے۔ وہ ٹین کی چھت والی ایسی جھگیوں میں بھی رہے تھے جو ہمارے بچپن کے زمانے میں ابھی گرائی جا رہی تھیں۔ انا کی ملازمت میں ترقی ہوتی گئی، اور انھوں نے تھوڑی سی بچت بھی کر لی تھی، تو امی اور ابا نے بہتر علاقے میں رہائش اختیار کرنے کی ٹھائی تا کہ ہماری پرورش کچھ بہتر طریقے سے ہو سکے۔ امی جس اسکول میں پڑھاتی تھیں اس میں ان کے ساتھ کام کرنے والی ایک خاتون نے انھیں بتایا تھا کہ جس عمارت میں وہ رہتی ہیں وہاں ایک فلیٹ خالی ہے۔ یہ عمارت ترکن کا مکان تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ ترکن کہاں سے آئی تھی یہ مکان اسے کیسے مل گیا تھا اور یہ کہ وہ واقعی تُرک تھی بھی یا نہیں ۔ وہ بمبیا اردو بولتی تھی، اس کے سُرخ بال کھردرے اور بکھرے بکھرے تھے اور وہ لمبی لمبی سہ پہروں میں ، جب سارا پڑوس سوتا تھا، گراموفون پر ایسے گیت سنتی رہتی جنھیں ہم" جنگی نغمے “کھتے تھے۔ اس کا یہ لق و دق مکان تھا اور ایک شوہر جو کبھی کبھار ہی امریکا سے آیا کرتا تھا اور اس کا بیٹا زیادہ لگتا تھا۔ ترکن نے دُسراہت کے خیال سے مکان کی دوسری منزل پر فلیٹ کرائے پر اٹھا دیے تھے اور آپا کا، جنھوں نے ہمارے لیے مکان ڈھونڈا تھا، کہنا تھا کہ بے دھیانی کے کسی لمحے میں ترکن نے ان سے اعتراف کیا تھا کہ جب وہ بالکل تنہا ہوتی ہے تو دیواریں اژدہوں اور بھیڑیوں کا روپ لے کر اس کی طرف بڑھنا شروع کر دیتی ہیں۔ اس کا کرایہ حیران کن طور پر کم تھا اور اس کے یہاں کوئی نوکر زیادہ دن نہیں لگتا تھا کیوں کہ اس میں دو بڑے عیبوں ۔ یعنی واگنر اور پنکی۔ کے علاوہ یہ عیب بھی تھا کہ مہینے میں ایک بار وہ غصے میں بھوت بن جاتی تھی اور اُس وقت جو بد نصیب بھی اس کی ملازمت میں ہوتا اس پر برس پڑتی تھی۔ اس موقعے پر وہ اس قدر زور سے چلاتی تھی اور ایسی فحش کلامی کرتی تھی کہ سارا پڑوس سنتا تھا۔ جن کے گھروں کی کھڑکیاں کھلی ہو تیں وہ فوراً انہیں اس فحش کلامی کے احتجاج میں بند کر لیتے، اور جن کی کھڑکیاں بند ہوتیں وہ یہ معلوم کرنے کے لیے انہیں بھڑاق سے کھول لیتے کہ آخر پڑوس کا سکون کون غارت کر رہا ہے۔

اکثر دوسرے دن نو کر ملازمت چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا اور وہ قدیم دمے کے آزار سے بستر میں پڑ جاتی تھی۔ ترکن کی آواز پر یوں تو ہمیشہ دمے کا اثر رہتا تھامگر چیخنے چلانے سے اس پر خاص طرح کے دورے پڑتے تھے۔ چند مہینوں کے وقفے سے محلے کا ڈاکٹر اپنی کھٹارا اوپل میں اس کا علاج کرنے آیا کرتا۔ آپا کی اماں کے مطابق، علاج ولاج تو وہ خاک کرتا ہو گا؛ بس بُڑھیا کا دل بہلانے آتا تھا اور جاتے ہوے اکثر اس میں سے اس برانڈی کی مہک آتی تھی جو وہ بڑی بی کے سینے کے لیے تجویز کرتا تھا۔

ان عیبوں سے ہٹ کر ترکن ایک خوش گوار، خاموش مزاج عورت تھی جو عام طور پر ایسے موقعوں پر بھی بس خاموشی سے مسکراتی اور سر ہلاتی رہتی جب وہ کبھی کبھار ریشمی گاؤن اور مہین اسکارف پہن کر رکشا میں بیٹھ کر کہیں جایا کرتی تھی اور سارے محلے والے اندازہ لگاتے رہ جاتے کہ وہ کہاں گئی ہو گی۔

چند ہفتوں کے وقفے سے وہ ہمیں بھی بلا بھیجتی۔ پھر وہ ہمیں طویل مسحور کن کہانیاں سناتی جن میں اڑنے والی مچھلیاں ہو تیں اور لکڑی کے گھوڑے ۔ حالاں کہ اس میں یہ پاگل کر دینے والی عادت تھی کہ کہانی ختم ہونے سے ذرا پہلے گہری نیند سو جاتی تھی۔ اس پر جب ہم کِھس کِھس کر کے ہنستے تو وہ جاگ پڑتی اور کھتی :کھانی سنانے کا فن ہی یہ ہے کہ اسے ادھورا چھوڑ دیا جائے۔ اگلی قط سننے کے لیے کل آنا۔" پھر ہم بھاگ جاتے اور کتنے ہی دن اس کے بلاوے کا انتظار کرتے رہتے، جو کئی ہفتوں کے بعد آتا۔ تب وہ کہتی : ”ہاں، تو ہم کہاں تک پہنچے تھے ؟ اور عین وہیں سے کہانی سنانا شروع کرتی جہاں پچھلی بار چھوڑا ہوتا، جیسے اس نے کسی دکھائی نہ دینے والی کتاب میں ریشی ڈوری سے نشا نی لگا رکھی ہو۔

۱۹۶۴ میں جب بھیا اور اماں ہندوستان سے آئے تو اس نے ایک مرتبہ عجیب سے انداز میں تبصرہ کیا تھا: ”چلو اچھا ہوا، دو سے بھلے چار ! '' اور ہوا بھی یہی، کہ شروع میں تو وہ بس گرمیاں گزارنے آئے تھے مگر پھر یہیں کے ہور ہے۔ اماں میرے ابا کی بیوہ بہن تھیں اور بھیا ان کے بیٹے، جو مجھ سے کچھ بڑے تھے؛ ان کی عمر سولہ سال رہی ہو گی جب میں دس برس کا ہوں گا۔ وہ ہمارے کچھ کھیلوں میں شریک ہوئے، کچھ نئے کھیل ایجاد کرتے، اور پھر اچانک بڑوں کی طرح پرے ہو جاتے اور اپنی جنگی کامک کتابوں، ریڈیو پروگراموں اور تنہا گھومنے پھرنے میں لگ جاتے۔ نہ جانے کس طرح انھوں نے کسی سے ایک کھٹارا سی موٹر سائیکل بھی خرید لی تھی۔ آپا کی اماں نے اس پر کہا تھا: " بہن کہنے کی بات تو نہیں ، اور اللہ معاف کرے جو میں کسی مصیبت کے مارے پر انگلی اٹھاؤں ، مگر یہ ماں بیٹے مہینوں سے تو تمھارے یہاں مہمان ہیں۔ جوان لڑکا ماشااللہ جی کھول کر کھاتا پیتا ہے مگر کام ٹکےکا نہیں کرتا۔ ایک تم ہو کہ دن بھر محنت کر کے سب کا پیٹ پال رہی ہو، اور یہاں صاحبزادے اپنے لیے موٹر سیکل خرید رہے ہیں۔

" اناں ، میں ملازمت اپنے شوق سے کرتی ہوں ، " امی نے کہا تھا، جو اُس وقت سے کام پر جا رہی تھیں جب ہماری عمر میں تین چار برس کی تھیں۔ پھر امی نے کہا تھا: ” یوں بھی یہ ہم پر بوجھ کہاں ہیں ! بچوں کے ساتھ میری نند میرا بڑا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ جبکہ اس بات میں بہت سچ نہ تھا، کیوں کہ ہمارا اسکول امی کے اسکول کے بعد بند ہوتا تھا اور امی بیشتر اوقات دو بھر کی سخت گرمی میں ہمیں اپنے ساتھ لانے کے لیے پینتالیس منٹ انتظار کرتی تھیں۔

کبھی کبھی بھیا ہمیں اسکول سے اپنے ساتھ لاتے۔ نہ جانے کن کر تبوں سے وہ ہم دونوں کو اپنی موٹر سائیکل پر جمانے میں کامیاب ہو جاتے، یہاں تک کہ ایک دن ابا نے ہمیں پکڑ لیا اور بھیا کو ٹریفک کے خطرات پر ایسی ڈانٹ پلائی کہ زندگی بھر نہ بھولیں۔ ظاہر ہے ہم نے ابا کو یہ نہیں بتایا کہ خطرے ہی میں تو سارا مزہ تھا۔ ابا اخبار میں کام کرتے تھے اور کچھ زمانے تک ان کے پاس ایک کار بھی تھی۔ صبح کے وقت وہ امی اور آپا کو ان کے اسکول چھوڑتے، اس کے بعد ہمیں ہمارے اسکول پہنچاتے اور پھر پولو گراؤنڈ کے پاس اپنے دفتر چلے جاتے تھے۔ اپنی کلاسیں لے کر آپارکشا میں ویمنز کالج چلی جاتی تھیں جہاں وہ ہسٹری اور پولیٹیکل سائنس کی کلاسوں میں بیٹھتی تھیں۔ ان کی تمنا تھی کہ وہ وکیل بنیں ، مگر ان کی عمر تیئیس برس کی ہو چکی تھی اور شادی اب تک نہیں ہوئی تھی۔ وہ کہتیں کہ اب تو وکالت پاس کرنے کا وقت نکل چکا ہے۔ امی دوسری رکشا لے کر گھر آتی تھیں اور اماں دونوں پر اعتراض کرتی رہتی تھیں ۔ ان کے نئے خیالات پر، شہروں کے طور طریقوں پر جن کے مطابق اکیلی عورتوں کے غیر مردوں کے ساتھ سواریوں میں مارے مارے پھر نے میں کوئی حرج ہی نہ تھا۔ امی ہمیشہ کی طرح خاموش رہتیں؛ اگر کبھی اماں کی جارحیت کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی تو چپکے چپکے رونے لگتیں۔ اماں کہتیں : " تو بہ ! میری بھی کیا مت ماری گئی ہے! بھنو، میری باتوں کا برا مت مناؤ۔ تمھارا ہی نمک کھا کر تمھیں پر اعتراض کر رہی ہوں۔ بُوا، میں شہری گنوارن، تم شہر والوں کے طور طریقے کیا سمجھوں !

" اماں عمر بھر اجمیر میں رہی تھیں۔ اماں بھی کہانیاں سنانے میں طاق تھیں ، مگر ان کی کہانیاں ترکن کی کہانیوں سے مختلف ہوتی تھیں۔ اماں کی داستانیں تو سچ مچ کے لوگوں کے بارے میں ہوتی تھیں، کنبے بھر کے ان ایک ہزار افراد کے بارے میں جنہیں ہم نہیں جانتے تھے؛ ان کی شادیوں اور بیاہوں اور منگنیاں ٹوٹنے اور بیویوں پر سو تیں لا بٹھانے کی کہانیاں۔ ہم گھنٹوں ان کی کہانیاں سن سکتے تھے، مگر کبھی کبھی سب رشتوں ناتوں کی ڈوریاں آپس میں ایسی الجھتیں اور مسئلے اتنے پچیدہ ہو جاتے کہ ہماری سمجھ میں خاک نہ آتا۔ پھر کبھی وہ اپنی رو میں بہہ جاتیں اور پارٹیشن“ کے قصے سنانے لگتیں، جس کے بارے میں ہمیں بھی کچھ کچھ پتا تھا کیوں کہ امی ابا بھی اس سے گزرے تھے، اور مذہبی دشمنیوں کے قصے، جو ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئے تھے کیوں کہ جس کراچی کو ہم جانتے تھے وہاں تو سب مسلمان رہتے تھے (سواے چند پارسی ٹیچروں کے، یا عیسائی ٹیچروں کے، یا بھنگیوں کے، جنہیں کنورٹ کھا جاتا تھا اور جو عیسائیوں سے مختلف تھے، جبکہ عیسائی یور و پینوں سے مختلف تھے۔) لگتا تھا کہ ہندوستان ایک نہیں بلکہ دو ہیں؛ ایک ہندوستان میں تو عجیب و غریب دیوی دیوتا ہیں جن کے چہرے ہاتھیوں کے ہیں اور لمبی لمبی دو مونہی زبانیں ہیں اور سیکڑوں بازو ہیں، اور دوسرا ہندوستان مسلمان نوابوں کا ہے جو لمبی، بل کھاتی ہوئی قبائیں پہنتے ہیں اور جہاں ہندو بڑی چھبوں والی بولیاں بولتے ہیں، اس میں ڈوبے گیت گاتے ہیں، رنگ برنگے کپڑے پہنتے ہیں اور موسم بہار کے پہلے دن ایک دوسرے پر اور مسلمانوں پر رنگین پانی اچھالتے ہیں۔

تو پھر مسئلہ کیا تھا ؟ اور اگر تھا، تو سارے مسلمان پاکستان کیوں نہیں آ گئے؟

اس پر اماں کھتیں : ارے آجائیں گے، آجائیں گے۔ تم ان کے لیے جگہ تو بناؤ۔"

بھیا نے لڑکوں کے ایک گروہ سے دوستی گانٹھ لی تھی جن کو ابا لوفر " اور اماں ٹیڈی “ کھتی تھیں ، اور وہ بھیا کو تلیر کھتے تھے جس کا مطلب ظاہر ہے کہ ایک چھوٹا سا پرندہ ہوتا ہے جو ہر وقت چوں چوں کرتا رہتا ہے۔ ایک دن اماں نے ابا اور امی کے لیے پان بناتے بناتے تلیر کا مطلب سمجھایا تھا۔ ابا نے اپنے مخصوص خشک، مختصر انداز میں کہا تھا: ہاں۔ وہ مجھے بھی یہی کھتے ہیں، جب ان کے خیال میں میں سن نہیں رہا ہوتا۔ خیر ، مہاجر سے اچھا القاب ہے جو قطعی ناموزوں ہے۔

امی نے خاموشی سے کہا تھا: "مگر آپ تو اتنے خاموش رہتے ہیں۔"

"مہاجر کیا ہوتا ہے ؟” میں نے پوچھا تھا، اور اماں نے مہاجروں کے بارے میں شیطان کی آنت جتنی طویل کہانی شروع کر دی تھی کہ کیسے لوگ بھاگے، اور کیسے ان کی طرح کے لوگ بے سہارا، بے یارومددگار رہ گئے اور اس وجہ سے سرحد پار کرنے پر مجبور ہوے۔ امی کے چہرے پر اسکول ٹیچر کا بچوں کے سامنے نہیں کھنے والا تاثر آ گیا، اور انھوں نے ایک دوسری کہانی شروع کردی۔

جب ہمارے رسول اللہ کو کافروں نے ان کے اپنے وطن مکہ میں پریشان کرنا شروع کیا تو وہ اور ان کے وفادار ساتھی مدینہ چلے آئے تاکہ وہاں ظلم و ستم سے دور ، مومنوں کی ایک بستی بسائیں۔ اسی کو ہجرت کہتے ہیں، اور مسلمانوں کا برسوں کا حساب اسی سے شروع ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے اس طرح ہجرت کی انہیں مہاجر کہا گیا۔ اور ہم لوگ بھی مہاجر ہیں کیوں کہ ہم پاکستان میں مسلمانوں کا ملک قائم کرنے کے لیے آئے ہیں۔

" مگر ہم تو بھاگ کر نہیں آئے تھے ، " ابا نے کہا۔ "ہم تو اپنی مرضی سے آئے تھے۔ " ابا ذرا بھی مذہبی نہیں تھے۔ اخبار کے اس ہفتہ وار کالم میں جو ابا ایک قلمی نام سے لکھتے تھے، انھوں نے ایک مرتبہ اپنے آپ کو تہذیبی لحاظ سے مسلمان " اور اگناسٹک لکھا تھا، اور اپنی اس تعریف پر انھیں بہت فخر تھا۔ (ہم بھی مذہبی نہیں تھے، مگر میں جمعے کے روز ا براہیم کے ساتھ مسجد جاتا تھا کیوں کہ مجھے وہاں لوگوں کی خوشبو اچھی لگتی تھی اور قومی ہیکل پٹھان جو پگڑی باندھتے تھے اور جن کی لال لال داڑھیاں ہوتی تھیں، اور پنجابی ، اور بنگالی ۔ اور رشوت ۔ ابراہیم ہمیں برفی کھلاتا اور اماں پان کھلاتیں اور امی کچھ روپے دیتیں۔ ندا بہت پاکیزہ بن کر نیلا دو پٹا سر پر منڈھے اماں کے ساتھ رکوع اور سجدے ادا کیا کرتی؛ نماز تو اسے اس وقت آتی نہیں تھی۔ اماں دن میں پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھیں اور امی ہفتے میں تین چار بار، اور ایک کا نونٹ اسکول میں ہفتے میں دو بار شدید گرمی میں اسلامیات پڑھا تیں۔ رمضان کے مہینے میں ہم سب روزے رکھتے کیوں کہ افطار میں ، اور سحری کے وقت اجالا ہونے سے پہلے اٹھنے میں ، اور چاند دیکھنے میں، بے حد مزہ آتا تھا۔)

جس دن امی کی اسلامیات کی کلاس ہوتی، اُس دن بھیا ہمیں اسکول سے لینے آتے۔بھیا ہمیشہ کسی نہ کسی مشکل میں گرفتار رہتے ۔ دوستوں کے خود کو "تلیر "کہنے پر گھونسا بازی، یا ابا کے ساتھ گھٹی گھٹی تکرار جب ابا ان سے کہتے کہ کوئی ہنر سیکھ لیں یا پڑھیں۔ ہندوستان کو برا بھلا کہنا انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ (ابا، امی اور آپا کے علاوہ لفظ "مہاجر" سے سارا خاندان چڑھتا تھا۔ آپا کی اماں مستقل لکھنو کا رونا روتی رہتی تھیں ، اور ایک مر تبہ اماں نے پلٹ کر کہا تھا: " تو پھر وہیں کیوں نہ رہیں ؟ میں تو شکر ادا کرتی ہوں کہ خدا کی بستی میں پہنچ گئی، جو ان کی عام طور پر سنائی جانے والی بیواؤں اور بے گھر بے در ہونے اور نسلی جنگوں سے ایک مختلف بات تھی۔ )

ارے ہاں، بھیا کو محبت ہو گئی تھی ۔ ایک لڑکی سے (انھوں نے ہمیں بتایا تھا) جسے انھوں نے ایک بار " نرسری " میں دیکھا تھا، جو کہ نرسری تھی ہی نہیں؛ شاید کبھی رہی ہو گی مگر اب تو دکانوں ، حلوائیوں، کیمسٹوں اور کاغذ فروشوں کی ایک بھول بھلیاں تھی۔ لڑکی نے بے حد چُست قمیص پر لال دوپٹا اوڑھ رکھا تھا، اور ، حالاں کہ وہ اس کا چہرہ بھول چکے تھے، ان کا کہنا تھا کہ لال دوپٹے کو تو وہ کہیں بھی پہچان لیں گے۔ اس زمانے میں وہ گھر بھر میں لڑکھڑاتے پھر تے اور ریڈیو کے ساتھ فلمی گانے گاتے رہتے۔ اپنی محبوبہ کی تلاش میں وہ تنہا موٹر سائیکل پر گھومتے پھرتے۔ آپا اور امی انھیں مجنوں اور فریاد کہہ کہہ کر خوب ہنستیں ۔ ایک دن بھیا نے قسم کھا کر کہا کہ انھوں نے اس لڑکی کو دوبارہ دیکھا ہے حالاں کہ انھیں اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ وہ ماڈرن اسٹورز سے اسکول کی کتابیں خرید رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک موٹی سی برقع پوش عورت بھی تھی۔ بھیا چوری چوری اسے دیکھتے رہے اور پھر چپکے سے نکل گئے۔ اب میری اور ندا کی عمر نو اور دس برس کی تھی اور آرچی کامک پڑھ پڑھ کر ہم استاد ہو گئے تھے۔ ہم نے اُن کا خوب ہی مذاق اڑایا اور بھیا شرم اور غصے سے لال بھبو کا ہو گئے۔ انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ اب کی بار وہ ضرور اس لڑکی سے بات کریں گے۔ اور جب ہم نے انھیں چڑایا کہ اب وہ پتا نہیں انھیں کبھی ملے گی بھی یا نہیں، تو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں، جس پر غصہ بھی آتا تھا اور پیار بھی ، کہا:

وہ وہیں ملے گی، اسی وقت اور اسی جگہ ! "

ایک جمعے کی سہ پہر کو وہ ہمیں ماڈرن اسٹورز گھسیٹ لے گئے۔ انھوں نے ہمیں آئس کریم اور نہ جانے کیا کیا کچھ کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ انہیں کسی سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ اور واقعی! پورے چھ بجے ایک بڑی حسین لڑکی چست قمیص پر لال دوپٹا اور ھے سچ مچ نمودار ہو گئی۔ بھیا نے آگے بڑھ کر اسے مخاطب کیا اور وہ پلٹی ۔ تو وہ تو آپا نکلیں !

ندا کو اور مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ یہ کہانی خاندان کی جھوٹی سچی داستانوں کے ذخیروں میں شامل ہے یا نہیں ، مگر سچ معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے تو آ پا ضرور اس وقت اپنی شخصیت کا وہ پہلو عیاں کر رہی تھیں جسے ابا ان کی " پوشیدہ شرارت کہتے تھے؛ وہ اتنی سنجیدہ تھیں ، لوگوں کے سامنے اس طرح خوب صورتی سے پیش آتی تھیں۔ آہ ۔ آیا ۔ جنگ کے پہلے کے وہ زمانے! مجھے ساحل سمندر کا ایک دن یاد ہے۔ امی اور آپا نے سینٹ زپٹ پر کسی سے دن بھر کے لیے ایک ہٹ لی تھی۔ ایک ابر آلود دن ہم نے سفید ریت پر اپنے کھانے پینے کے سامان سمیت پکنک منائی تھی۔ ہم جیلی فش اور کیکڑوں کے پیچھے بھٹکتے پھرے تھے اور ہم نے اونٹ کی سواری کی تھی۔ ندا کا ایک جوتا کھو گیا تھا اور آپا نے اسے سنڈریلا کھا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی سالگرہ پر اسے سنڈریلا کا سا خوب صورت لباس سلوا دیں گی۔ اماں اور آپا کی اماں ہٹ کے اندر بیٹھی پان کھاتی اور بنیاتی رہی تھیں۔ ان دونوں کی اب خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ دونوں آپس میں بیٹھی اگر ہندوستان کو یاد نہ کرتی ہوں تو ترکن کے پر خچے اڑاتی تھیں۔ پنکی نے اماں کا اجمیر سے لایا ہوا ایک قیمتی چینی کا پیالہ توڑ دیا تھا اور آپا کی اماں کے کشن کا برو کیڈ کا غلاف چیتھڑے کر دیا تھا۔ بھیا اور آپا نے ریت پر کیکلی کھیلی تھی اور تیزی سے درویشوں کی طرح گھومے تھے۔ اماکا فیصلہ تھا کہ ہم ساحل سمندر پر غروب آفتاب کا نظارہ کرنے کے بعد واپس چلیں گے۔ ابا کو کراچی کے آتشیں آسمانوں سے، پام کے درختوں سے اور انوکھے پھلوں اور پھولوں سے عشق تھا۔ وہ اردو اور انگریزی کہ اشعار پڑھتے رہے تھے اور امی بیٹھی مسکراتی رہی تھیں۔ پھر امی اور آپا نے کجری گائی تھی اور دونوں بیوائیں تک اپنی بوڑھی ، عمر رسیدہ آوازوں کے ساتھ گیت میں شامل ہو گئی تھیں۔

یہ امی کے اسکول سے کچھ مہینے کی چھٹی لینے سے پہلے کا واقعہ ہو گا، بلکہ امی تو پھر واپس کبھی اسکول گئی ہی نہیں تھیں۔ ابا ہمیشہ کی طرح ہمیں اسکول لے جاتے رہے تھے اور آپا کو بھی چھوڑتے رہے تھے۔ ایک صبح انھوں نے باغ سے ایک لالہ کا پھول توڑا تھا اور جب ہم کار میں بیٹھے تو جھجکتے ہوے آپا کے چمکیلے سیاہ بالوں میں لگا دیا تھا۔ اس کے بعد دو دن تک امی ابا سے نہیں بولی تھیں۔ ابا ان کے پیچھے پیچھے یہ کھتے پھرتے رہے تھے: ”ناراض ہو گیا ؟ مجھ سے کیا خطا ہو گئی ؟ اور پھر پہلی بارانی پھٹ پڑی تھیں اور ان کی زندگی کی سختیوں کی ، جد وجہد کی اور دکھ بھرے برسوں کی کہانیاں سامنے آ گئی تھیں اور ہم بھونچکا رہ گئے تھے ۔ ہم نے تو ہمیشہ یہی سمجھا تھا کہ امی تو بہت خوش ہیں۔

دوسرے دن انھوں نے ہمیں آپا سے بات کرنے، بلکہ ان کے منہ پڑنے ہی سے منع کر دیا تھا۔ آ پا اب بھی کبھی کبھی آئیں، تھوڑی سی شکر مانگنے ، یا کوئی مزے دار چیز دینے جوان کی اماں نے خاص طور پر امی کے لیے پکائی ہوتی (جو اَب زیادہ تر وقت بستر میں پڑی رہتی تھیں)؛ مگر ان کی دوستی میں ایسی دراڑ پڑ گئی جسے وہ دوبارہ بھر نہ پائی تھیں۔

۱۹۶۵ کی جنگ نے یہ سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا، حالاں کہ اب سوچیں تو وہ چھوٹی موٹی لڑائی سے زیادہ نہ تھی۔ آسمانی جنگجوؤں کی، بھٹکے ہوے فوجی کے لیے سیاروں اور اولیاؤں کے نزول کی حکایتیں اُس وقت کے واقعات کا اتنا ہی اہم حصہ تھیں جتنا کہ بمباری یا بلیک آؤٹ ... کیا کراچی میں بم گرے تھے ؟ کیا ہم نے شیلنگ کی آواز سنی تھی ؟ مجھے تو اس زمانے کے صرف بچوں کے جنگی کھیل یاد ہیں جو ہم کھیلا کرتے تھے، یا ریڈیو کے طویل براڈ کاسٹ، اور اپنی فوج کی شان میں قصیدے۔ ہم بچے اب "جنگ جنگ کھیلتے تھے، اور بھیا اسے کچھ زیادہ سنجیدگی سے لے کر اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر فوج میں بھرتی ہونے جا پہنچے تھے ۔ اور جب انھیں لینے سے انکار کر دیا گیا تھا تو اور بھی رنجیدہ اور چڑچڑے رہنے لگے تھے۔ ابا ہنسےتھے، اور اماں نے کہا تھا: "ہم ہندوستانی جو ہیں! اور بھیا بھی ان کے احتجاجی واویلے میں شامل ہو گئے تھے۔ ان دونوں نے ابھی حال ہی میں شہریت حاصل کرنے کی درخواست داخل کی تھی اور پاکستانی پاسپورٹوں کے منتظر تھے۔ فی الحال قانوناً ان کا کوئی ملک نہ تھا۔ آپا کی اماں انہیں ہوشیار کرنے آئی تھیں کہ کچھ علاقوں میں ہندوستانی پاسپورٹ رکھنے والوں سے جاسوسی اور مخبری کے شبے میں پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔ یہ افواہیں ترکن نے بھی سنی تھیں اور اپنی دقیا نوسی انگریزی میں ابا کو کھر الکھ بھیجا تھا کہ گو وہ حالات کو سمجھتی ہے مگر پھر بھی وہ اپنی عمارت میں دشمن ملک کے باشندوں کی موجودگی کو پسند نہیں کرے گی۔ ” یہ آپ ہی کو مبارک رہیں۔ والسلام ۔"

جوا با ًاماں اور آپا کی اماں نے پولیس کو فون کر دیا تھا کہ ترکن بلیک آؤٹ کی ٹھیک سے پابندی نہیں کرتی۔ یہ سچ بھی تھا۔ ترکن کو ہول کا عارضہ تھا اور پنکی کو اندھیرے میں اس کے بیش قیمت کرسٹلوں میں گشت لگانے کی زِچ کر دینے والی عادت تھی، اور بوکھلاہٹ میں اسے یوں بھی لگتا تھا کہ اس کے مکان میں پیراٹرو پر رینگتے پھر رہے ہیں، جس پر اس کی حرکت قلب بے حد بڑھ جاتی تھی۔ اس وقت وہ کھٹاک سے کوئی نہ کوئی لیمپ روشن کر دیتی اور اس کے نیم وا پردوں سے روشنی چھننے لگتی تھی۔ ایک دفعہ بھیا اسے متنبہ کرنے نیچے گئے تھے کہ پردوں کی دراڑ سے روشنی نظر آ رہی ہے، اور ترکن پر تقریباً دل کا دورہ پڑ گیا تھا کیوں کہ وہ بھیا کو پیراٹرو پر سمجھی تھی۔ وہ بد مزاجی کا خط شاید اس نے اسی وجہ سے لکھا تھا۔

تر کن کا بلا جنگ کے ساتویں دن غائب ہو گیا تھا اور پھر کبھی واپس نہ آیا تھا۔ اس کی لاکھ کوششوں اور انتظار کے باوجود وہ پھر کبھی نہ ملا تھا۔ چند دن تک وہ روتی رہی تھی اور پھر اپنے جنگی نغموں اور چیخم دہاڑ کے دوروں میں غرق ہو گئی تھی۔ ہاں کسی کسی رات کو اُس کے چپکے چپکے چلنے پھرنے کی آہٹیں اور اس کی سر گوشیاں سنائی دیتیں : "پنکی، پنکی، تیر اکھانا تیار ہے۔" ابراہیم سب سے زیادہ بھوں بھوں کر کے رویا تھا، یہ کہہ کہہ کر کہ پنکی اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور ایسے لوگوں کی دہائی دے دے کر جو بلّیوں کو قتل کرتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ دوسرے نوکروں کو ملزم ٹھہرا رہا ہے، اور چوں کہ اس عمارت میں کئی ملازم تھے اس لیے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس پر الزام لگا رہا ہے۔ اور پھر ایک دوسری سر بستہ داستان کا انکشاف ہوا۔ بھنگی کے بیٹے پیٹرک نے بتایا کہ بھیا لڑکوں کے اس گروہ کے سرغنہ تھے جنھوں نے پنکی کو پکڑ کر ایک پتھروں بھری بوری میں بند کر دیا تھا اور پاس والے سبز آبی پودوں سے بھرے تالاب پر لے گئے تھے۔ انھوں نے پنکی کو ڈُبا دیا تھا، مگر اس سے پہلے انھوں نے بوری پر چھڑیاں برسائی تھیں اور “ بھارتی ظالم مردہ باد کے نعرے لگائے تھے۔ پیٹرک کا کہنا تھا کہ بھیا بالکل کسی فلم کے فوجی کی طرح قومی نغمے گا رہے تھے اور " پاکستان زندہ باد اور ایوب خاں زندہ باد کے نعرے لگار ہے تھے۔

ہماری عمریں ابھی دو تین سال کی ہوں گی کہ ایوب خاں اس کے بعد آنے والے آٹھ برسوں تک کے لیے ہماری زندگیوں کا اہم حصہ بن گیا تھا۔ ہمیں پوسٹروں اور تصویروں میں اس کا مسکراتا ہوا وجیہہ چہرہ یاد تھا اور جنگ کے زمانے میں تو ہم اس کے اور بھی گرویدہ ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے ایک پریڈ میں مارچ پاسٹ کر کے اسے سلیوٹ بھی کیا تھا اور فخر سے پھولے نہ سمائے تھے۔ مگر ابا اور امی اسے پسند نہیں کرتے تھے اور انھوں نے پچھلے الیکشن میں فاطمہ جناح کو ووٹ دیا تھا جو مادر ملت تھیں۔ محترمہ فاطمہ جناح کی حکومت ہوتی تو یہ سب نہ ہوتا، "انا کہتے۔ گھر میں بڑوں کی ان باتوں کے (جو بچوں کے آتے ہی بند کر دی جاتیں) ہم نے ہونہہ! بھارتی جارحیت! " اور "احمقانہ جنگ" جیسے ٹکڑے سنے تھے۔

جنگ کے اختتام پر ابا کے ادارتی مواعظ اور بھی حکومت مخالفت ، فوج مخالف اور سوشلزم حامی ہوتے گئے تھے۔ انھوں نے ایک بین شدہ کمیونسٹ شاعر کا کلام شائع کر دیا اور اخبار کے اس کے بعد والے دو دنوں کے پرچے ضبط کر لیے گئے تھے۔ ۱۹۶۸ میں وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان چھوڑ کر دوبئی چلے گئے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ ہی نکل آئے تھے۔ اماں اور آپا کی اماں نے اپنی بچت اور توانائیاں ملا کر ایک دکان کھول لی تھی جہاں وہ بچوں کے کپڑے فروخت کرتیں جن کے ڈزائن وہ خود تیار کرتیں اور محلے بھر کی غریب عور توں اور بیواؤں سے کم سے کم اُجرتوں پر سلواتی تھیں۔ (امی کا یہی کھنا تھا۔) جنگ کے کچھ ہی عرصے بعد آپا نے ایک بارانی کے پاس بیٹھ کر کہا تھا: "میں قریشی صاحب سے شادی کر لوں ؟ " قریشی صاحب ایک بہت موٹے پنجابی تھے۔ ان کی آنکھیں بھیگی تھیں اور ان کے پاس بہت پیسا تھا۔ ہم بھونچکے اور کرامت زدہ ہو کر رہ گئے تھے، اور امی تک نے کہا تھا: "نازلی، تم اتنی پیاری شکل کی لڑکی ہو۔ ذرا صبر کرو، تمھیں اپنے قابل لڑکا ضرور مل جائے گا۔ مگر آپا نے نفی میں سر ہلا کر کہا تھا: "میری عمر نکلی جا رہی ہے۔ یہ پیسے والا ہے اور جہیز نہیں مانگتا۔ " شادی سے چند ہفتے پہلے انھوں نے اسکول میں پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ سنہری گھونگھٹ میں آیا بڑی حسین دلھن بنی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا دولہا بھڑکیلی پگڑی باندھے اور پھولوں اور پٹیوں کے ہار پہنے کوئی در باری مسخرہ لگ رہا تھا۔ امی بھی اس دن بڑی خوب صورت لگ رہی تھیں۔ ان کی گود میں ہمارا منا سا بھائی تھا۔ ( ہمیں ذرا شرمند گی ہوئی تھی کیوں کہ میں گیارہ برس کا ہونے والا تھا اور ندا نو سال کی تھی؛ ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ ہمارا اب کوئی نیا بہن بھائی پیدا ہو گا۔ جب جنگ کے دنوں میں امی کو الٹیاں ہوتی رہیں ، اور آخر کار انھوں نے بتایا کہ کیوں ، تو ندا نے بے حد خوش ہونے کا سوانگ رچایا تھا اور شاید بس مجھے جلانے کے لیے کہا تھا: ”اب کی بار ایک منی سی بھی آئے گی۔ کچھ دنوں تک اس نے اون اور سلائیوں سے کچھ بے ہیئت سی چیزیں بننے کا بھی ناٹک کیا تھا اور پھر چھوڑ چھاڑ دیا تھا۔ جب ہمارا منا بھائی آیا تو اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی اور اپنی مشغولیتوں میں لگی رہی تھی۔ یوں بھی اب ہمارے کھیلوں کا اختتام ہو چکا تھا ۔ جانے کیسے، جنگ، منے کی پیدائش اور پنکی کے غائب ہو جانے کے بعد ہمیں کسی بھی چھوٹے جاندار کو مارنا ظالمانہ بات لگنے لگی تھی، اور ہم نے پھر گر گٹوں پر کبھی غلیل نہیں چلائی۔)

بھیا ۱۹۶۹ میں فوج میں بھرتی ہو گئے تھے اور ۱۹۷۱ میں بنگلادیش والی جنگ میں اپنا ایک بازو اڑوا بیٹھے تھے۔ احمق کہیں کا! اس کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا، " ابا نے کہا تھا، اور امی، دوبئی میں رہ کر جن کے مزاج میں نرمی آ گئی تھی، بولی تھیں: کیا بات کرتے ہیں! کسی کے ساتھ بھی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنا راست بازو گنوا بیٹھے۔ " اس پر ابا نے کہا تھا: ''دیکھنا اب اسے کتنے تمغے ملیں گے، اور اپنے بھائیوں پر بندوق اٹھانے سے یہی سب کچھ ملتا ہے ۔"

بوڑھے ابراہیم کو ہم اپنے ساتھ امی کے چاہنے کے باوجود دوبئی نہیں لے جاسکے تھے۔ پنکی کے جانے کے بعد وہ بالکل پاگل سا ہو گیا تھا اور اس کی عمر بھی اسی برس کی ہو گئی تھی۔ اماں نے اسے اپنے پاس رکھنے کی پیشکش کی تھی مگر اس نے بھیا کو کبھی معاف نہیں کیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اماں کے خاندان کی آمد ہمارے لیے نیک فال نہیں تھی۔ تعجب اس پر تھا کہ وہ ترکن کے ساتھ رہتا رہا۔ برسوں بعد جب امی ایک بار کچھ چیزیں لانے پاکستان گئی تھیں تو انھوں نے ابراہیم کو تلاش کیا تھا، اور ترکن نے بتایا تھا کہ وہ پاس والی مسجد میں رہتا ہے۔ شاید اس نے ابراہیم کو بھی اپنے جنگی نغموں اور چیخ پکار کے ماہانہ ڈرامائی راگ کا نشانہ بنا یا ہو گا۔ امی نے بتایا کہ ترکن نے ایک بار اس پر جھاڑو سے حملہ کیا تھا، مگر وہ پاگل کر دینے کی حد تک احمق تو تھا۔ جب امی مسجد میں اس سے ملنے گئیں تو، انھوں نے بتایا تھا، ابراہیم نے انھیں بالکل نہیں پہچانا اور گندی گندی گالیاں بکتا رہا۔ بھیا کا کہنا تھا کہ وہ ساری دنیا کو گالیاں دیتے ہوے مرا تھا۔ اس کی عمر تب نوے برس کی ہو گی۔ اور امی نے کہا تھا کہ کراچی اتنا بدل گیا ہے کہ اب وہ شہر ہی نہیں لگتا جسے ہم چھوڑ کر آئے تھے۔ کراچی اب وہ نہیں رہا تھا، اور پاکستان میں ہنوز فوج کی حکومت تھی۔

**رضا علی عابدی**

**چوہدری عبد الہادی کا آختہ**

میں بتاتا ہوں کہ اسرار کہاں گیا، لیکن پہلے آپ کو اصرار کا پورا قصہ سننا ہو گا۔

اس کے باپ سر کار احمد کی تنہائی کو جب بہت عرصہ گزر گیا تو دوست اس کے پیچھے پڑے اور وہ دوسری شادی کرنے پر رضامند ہو گیا۔

لڑکی والوں کا اصرار تھا کہ اسے خود آ کر سسرال میں رہنا ہو گا؛ ہاں ، اسرار کو وہ ساتھ لا سکے گا۔

یہ بھی طے پایا کہ سسرال والے اسرار کو گھر کا لڑکا تصور کریں گے اور اسی طرح اس کی نئی بیوی کے پہلے شوہر سے جو دو لڑکے ہیں ، سر کار احمد انھیں اپنے بیٹے تصور کرے گا۔

بعد میں کچھ لوگوں نے بہت کہا کہ سر کار احمد نے اس طرح کی شرائط مان کر حماقت کی اور اسے یہ کرنا چاہیے تھا، وہ کرنا چاہیے تھا، مگر سر کار احمد نے معاملات پر اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ اس کے سامنے فلاح کی یہی ایک راہ تھی۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ اسرار کو رہنے کا ٹھکانا مل جائے گا جہاں وہ جی لگا کر پڑھے لکھے گا اور بڑا آدمی بنے گا۔

وسری بیوی کا نہ صرف گھرانا بلکہ اس کی پوری بستی قبائلی رسم و رواج پر قائم تھی۔ ان کے دستور جتنے پرانے تھے اتنے ہی نرالے بھی تھے۔ سر کار احمد کو یقین تھا کہ ہونہار بیٹا کچھ تو خود کو اس رنگ میں ڈھال لے گا، کچھ اپنی ذہانت سے ان لوگوں کی طینت بدل دے گا۔

آخر شادی ہوئی۔ سر کار احمد اور اسرار اپنا تھوڑا بہت مال اسباب لے کر رحمتی منتقل ہو گئے۔ اسرار کہا کرتا تھا کہ اور کچھ ہو نہ ہو، بستی کا نام اچھا ہے۔

بستی بھی کچھ ایسی بری نہ تھی۔ شروع شروع میں دونوں کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ محدود وسائل میں زندگی کی جتنی آسائشیں ممکن تھیں ، مہیا کر دی گئیں۔ اسرار نے اپنی تعلیم جاری رکھی ، البتہ اسے یہ دکھ ستانے لگا کہ یہ جو اسے دو بھائی ملے ہیں، یہ دو تین جماعتیں پڑھ کر گھر بیٹھے رہے ہیں۔ ہر وقت یا تو چاے پیتے رہتے ہیں یا پان کھاتے رہتے ہیں۔ ریڈیو کے فرمائشی پروگرام میں خط لکھتے رہتے ہیں۔ فلمی گانے گاتے رہتے ہیں اور خود بھی تک بندی کرتے کرتے شاعر بن بیٹھے ہیں۔ ایک نے اپنا نام زخمی رکھ لیا ہے اور دوسرے نے بے بس۔ صرف یہی نہیں، زخمی کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے، کوئی پڑھی لکھی لڑکی بیاہ کر گھر میں آنے والی ہے۔

پھر ایک اور دُکھ نے اسے آن دبوچا۔ باپ ایک روز بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ اسے بھی اس ٹیلے کے اوپر دفن کر دیا گیا جہاں ہری سنگھ نلوا سے جنگ کرنے والے شہید دفن تھے۔ بستی میں سوگ بھی منایا گیا اور سر کار احمد کا مزار تعمیر کرنے کے لیے ہاتھ کے ہاتھ چندا بھی جمع ہونے لگا۔

اوپر سے غضب یہ ہوا کہ اسرار کے ساتھ گھر والوں کے سلوک میں فرق آنے لگا۔ وہ ذہین بھی بہت تھا۔ محنتی بھی تھا۔ اب تو ملازمت کر کے اچھی بھلی رقم بھی گھر میں لانے لگا تھا، مگر وہ سب سے جدا تھا ، آوروں سے مختلف تھا۔ کچھ تو وہ خودداری کہیں سے لے آیا تھا۔ کچھ یہ کہ غلط بات کو غلط کہہ دیتا تھا۔

بستی کے طور طریقوں کے کھانچے میں اس کے یہ انداز ٹھیک طرح سے نہ بیٹھ سکے۔ کبھی اس نے کہہ دیا کہ چھت کے اوپر گھاس بہت آگ آئی ہے۔ زخمی اور بے بس بے کار بیٹھے رہتے ہیں، ان سے کہا جائے کہ چھت پر چڑھیں اور گھاس اتاریں۔ اس پر بھائی روٹھے سو روٹھے، ماں بھی ہو گئی اور لگی طرح طرح کے طعنے دینے۔

وہ جب مہینے بھر کی تنخواہ لا کر ماں کے ہاتھ پر رکھتا تو فوراً لے لی جاتی ، لیکن جب کہتا کہ دیے کی روشنی میں اس سے پڑھا نہیں جاتا، اسے لالٹین دلوا دی جائے تو بستی کے چوہدری سے شکایت کی جاتی کہ ماں کو سوتیلی سمجھنےلگا ہے۔

ایک روز اس نے کہا کہ تکیے کا غلاف بہت میلا ہو چکا ہے اسے دُھلوا دیا جائے تو اگلے روز دفتر سے واپسی پر جب چوہدری عبدالہادی ملے تو کھنے لگے کہ سنا ہے تم آمادہ بغاوت ہو۔

اسرار نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ سمجھا کہ شاید اس کی پشت پر کوئی اور کھڑا ہے اور چوہدری صاحب اس سے مخاطب ہیں۔

چوہدری صاحب کبھی فوج میں رہ چکے تھے اور محاذ پر بھی جا چکے تھے۔ ہم کا ایک کمڑا اڑ کر ان کے گال کو کاٹ گیا تھا۔ کسی اناڑی ڈاکٹر نے کٹے ہوے گال کو چٹکی میں پکڑ کر یوں ٹانکے لگا دیے تھے جیسے موچی جوتا گانٹھتا ہے۔ اب اس کا بدہیئت نشان باقی تھا۔ چوہدری صاحب کسی کے سامنے آئے تو نگاہ پہلے ان کے گال پر پڑتی، پھر خود ان پر۔

چوہدری صاحب بایاں ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتے تھے۔ دایاں ہاتھ ان کے پتلون کی جیب میں اتنا زیادہ پڑا رہتا تھا کہ زین کے پتلون کی ایک جیب بری طرح میلی ہو چکی تھی اور دوسری بالکل اُجلی تھی۔

اسرار سے بولے کہ سنا ہے تم باغی ہو گئے ہو اور آمادۂ فساد ہو۔ سنا ہے بڑے بڑے مطالبے کرنے لگے ہو اور چاہتے ہو کہ ماں تمھارے لیے بھی وہی سب کرے جو اپنے اصل فرزندوں کے لیے کرتی ہے۔ ٹھیک ہے، بہت قابل ہو، لیکن اگر ساری مراعات تم لے لو گے تو بچارے ان لڑکوں کو کیا ملے گا؟

غضب یہ ہوا کہ اسرار انھیں اپنی بات سمجھانے لگا۔ بات ابھی جاری تھی کہ چوہدری عبد الہادی کے اندر کا ریٹائرڈ فوجی ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لیے مچلنے لگا۔

اسرار رخصت ہونے لگا تو بڑے ادب سے بولا، "خداحافظ۔"

وہ اتنے ہی کڑک کر بولے، "اللہ حافظ ۔ "

اس کے بعد یوں لگا کہ پہلی تاریخ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اِدھر اسرار نے تنخواہ لا کر ماں کی اس ہتھیلی پر رکھی جس کی لکیریں اندر سے اس طرح کالی تھیں جیسے ان میں میل بھرا ہو، اُدھر چوہدری عبدالہادی نے بگل بجا دیا۔ اعلان ہوا کہ اسرار سرکش ہو گیا ہے۔ اُس کا فیصلہ کرنے کے لیے قبیلے کی پنچایت بیٹھ رہی ہے۔

پنچایت بیٹھی۔ اسرار یہ سوچ کر گیا کہ پہلے اس کا بیان سنا جائے گا۔ وہ بے شمار باتیں طے کر کے گیا۔ یہ پوچھا جائے گا تو یہ کہوں گا۔ یہ سوال ہو گا تو یوں جواب دوں گا۔

وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ پنچایت اس کا بیان سننے کے لیے نہیں، اپنا فیصلہ سنانے کے لیے بیٹھی ہے۔ اُس روز اس نے دیکھا کہ چوہدری عبدالہادی کا دایاں ہاتھ کلائی تک کٹا ہوا تھا۔ کھتے ہیں کہ میدان جنگ میں بارودی سرنگ کو ناکارہ بنانے جا رہے تھے مگر پہلے بارودی سرنگ کا داؤ لگ گیا۔

فیصلہ سنا دیا گیا۔ چوہدری صاحب نے کہا کہ اسرار شادی شدہ ہوتا تو اس کا نکاح فسخ کر دیا جاتا۔ ایسے موٹے موٹے الفاظ اسرار نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ اب چوں کہ وہ کنوارا تھا اس لیے قبیلے کی پرانی رسم کے مطابق اسے سرکشی، فساد اور بغاوت کی یہ سزا دی جائے گی کہ پورے ایک مہینے تمام قبیلہ یوں تصور کرے گا جیسے اسرار کسی کو نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ وہ بستی میں رہے گا، گھر ہی میں رہے گا، لیکن بستی والے اور گھر والے اول تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں گے نہیں اور اگر دیکھیں گے تو یوں جیسے وہ وہاں ہے ہی نہیں۔

چوہدری عبدالہادی نے جوں ہی اپنا کٹا ہوا ہاتھ دوبارہ جیب میں ڈالا، یوں لگا کہ کسی بڑے سیشن جج نے سزاے موت کے حکم پر دستخط کر کے اپنا قلم توڑ ڈالا ہو۔ فوراً ہی فیصلے پر عمل در آمد شروع ہو گیا۔ اسرار ابھی وہاں تھا، ابھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

راستے میں فتو فقیر نی ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی، وہی ہاتھ جس میں لے دے کر ایک اسرار ہی چوٹی ڈالا کرتا تھا۔ اسرار کو دیکھتے ہی فتو نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ پٹواری ملا جس کا نام شاید فضل یا افضل تھا، اُس نے اسرار پر یوں نگاہ ڈالی جیسے اسے نہیں بلکہ اس کے اندر سے دور تک دیکھ رہا ہو۔ رحمت حلوائی کی نگاہ دودھ کے کڑھاؤ سے اٹھنے والی سفید بھاپ پر تو ٹھہر گئی، اسرار پر نہ ٹھہر سکی۔ غلام محمد ہومیو پیتھ چھڑی ٹیکے ہوے جا رہے تھے۔ زمین سے ابھری ہوئی ایک جڑ سے اُلجھ کر گر پڑے لیکن اٹھنے کے لیے اسرار کا سہارا قبول نہیں کیا بلکہ بے بسی سے قریب کھڑی ہوئی بکری کو یوں دیکھنے لگے جیسے وہ جا کر کسی شخص کو بلا لائے گی، کسی تابعدار، فرماں بردار، کسی نظر آنے والے شخص کو۔

اسرار گھر میں داخل ہوا تو ماں دیواروں کو دیکھنے لگی۔ زخمی زور زور سے کوئی گانا گانے لگا۔بے بس فلمی رسالہ کھول کر تصویریں دیکھنے لگا۔ ملازمہ سر جھکا کر جلدی جلدی جھاڑو دینے لگی۔ صرف زخمی کی بیوی قریب سے گزری تو اسرار کو محسوس ہوا کہ وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ گزرتی چلی گئی اور سوندھی مٹی سے ملتے جلتے اس کے عطر کی خوشبو وہاں رہ گئی۔

سامنے والے مکان سے نوکر کو بلایا گیا جس نے آ کر اسرار کے سامنے کھانا رکھا مگر وہ بھی اسرار کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے خلا کو دیکھ رہا ہو۔ کھانا سامنے رکھ کر اور پانی دیے بغیر وہ تو چلتا بنا، اسرار نے جوں توں کر کے کچھ لقمے نکلے اور منہ ہاتھ دھو نے انگنائی میں چلا گیا۔ واپس آیا تو تپائی پر پانی سے بھر اہوا گلاس رکھا تھا اور ہوا میں سوندھی مٹی کی خوشبو تھی۔

صبح وہ کام پر جانے لگا تو کسی نے اسے رخصت نہیں کیا۔ راہ میں جو بھی ملا اس پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر رہ گیا۔ کنویں کے قریب جو چتکبر اکتا اس پر بھونکتا تھا وہ بھی آنکھیں نیچے بیٹھا رہا۔

شام کو وہ تھکا ہوا گھر آیا اور چار پائی پر بیٹھ کر حساب لگانے لگا۔ اس کی سزا تنخواہ والے روز ختم ہو گی۔ جب وہ ذرا موٹا سا بٹوا جیب میں ڈالے گھر لوٹے گا تو فتو بھی اس سے چوّنی مانگے گی، چتکبرا کتا بھی اس پر بھونکے گا۔ خود اسے ماں کی پھیلی ہوئی ہتھیلی بھی نظر آئے گی جو خود کو اچھی خاصی چٹی ہو گی مگر جس کی لکیر یں اندر سے سانولی ہوں گی۔ یہ سوچ کر اسرار پہلے تو مسکرا یا کرتا تھا لیکن اس شام اس نے چاہا کہ مسکرائے تو مسکرایا نہ گیا۔

کسی نوکر نے لا کر تپائی پر کھانا رکھا۔ سارے وہی پرانے نام چینی کے برتن تھے، البتہ کھانے کے ساتھ پانی سے بھرا ہوا گلاس بھی تھا جسے کسی نے اچھی طرح دھویا تھا اور اس میں سوندھی مٹی کی خوشبو بھی تھی ۔

ایک رات تو اصرار حیرت سے اچھل پڑا۔ سونے کے لیے اس نے تکیے پر سر رکھا تو اسے یقین نہ آیا۔ تکیے کا غلاف ڈھلا ہوا تھا اور اس میں ہلکی ہلکی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی، بالکل برسات کے پہلے چھینٹے والی۔ وہ خوش ہوا اور اس نے چاہا کہ اسے ہنسی آجائے ۔ وہ آ گئی۔

اب وہ مہینے کی تاریخیں گنے لگا۔ اب اُسے پہلی تاریخ کا انتظار رہنے لگا۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس کے دفتر کے کلرکوں کو پہلی تاریخ کا اتنی بے چینی سے انتظار کیوں رہتا ہے۔ وہ سب نظر آنا چاہتے ہیں۔

ایک روز حساب لگاتے لگاتے اس نے کہیں راہ میں چوہدری عبدالہادی کے بیٹے سے تاریخ پوچھ لی۔ اس وقت تو بیٹا دوسری طرف دیکھتا ہوا گزر گیا۔ شام کو جب اسرار کام سے واپس آیا تو اسے اپنے سرھانے رکھا ہوا ایک پر چا ملا۔ اس نے پڑھا۔ بالکل یوں لگا کہ لکھوایا ہے کسی ریٹائرڈ فوجی نے اور لکھا ہے زخموں کو چٹکی میں پکڑ کر ٹانکے لگانے والے کسی ڈاکٹر نے۔

اس میں لکھا تھا کہ آئندہ اگر تم نے بستی میں کسی سے بات کرنے کی تو تمھیں آختہ کر دیا جائے گا کہ اس قبیلے کی رسم یہی ہے۔

نہ وہ نکاح فسخ ہونے والی بات اس کی سمجھ میں آئی تھی نہ یہ آختہ جیسا لفظ اس کی سمجھ میں آیا۔ اس نے ذہن پر بہت زور ڈالا۔ شاید حواس آختہ ہو جاتے ہیں، یا شاید سبق دہرانے کو آختہ کھتے ہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ ذخیرے کو آختہ کہتے ہیں۔ مگر اس کا کیا مطلب ہوا؟ وہ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا ۔ وہ ذہن پرزور ڈالتے سوگیا۔

رات کو جب کبھی اسرار کی آنکھ کھلتی، ذہن میں یہ نیا لفظ بے کل ہوتا۔ ایک بار اُس کی آنکھ کھلی تو اسے یوں لگا جیسے ابھی کوئی سرھانے کھڑا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر بہت دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ پھر باہر برآمدے سے چوڑیاں کھٹکنے کی اور کاغذ کا پرزہ پھاڑنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اسرار نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بہت دیکھا۔ ہوا میں سوندھی مٹی کی خوشبو تو شنگھائی دی لیکن نظر کچھ نہ آیا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، پہلی تاریخ دور سر کتی گئی۔ بستی والوں نے اسے نظروں سے اس طرح اوجھل کر دیا کہ ایک روز ایک سائیکل والا اس سے ٹکرایا تو یوں حیران ہوا جیسے ہوا کے کسی جھونکے سے ٹکرا یا ہو۔

ڈا کیا اس کا خط لایا تو ہا تھ میں دینے کے بجاے دور سے یوں پھینکا جیسے خط اس کے قدموں میں نہیں ، دریا میں پھینک رہا ہو۔

پھر ایک رات نڈھال ہوکر اس نے خود کو بستر پر یوں گرایا جیسے بستر پر نہیں دریا میں گرا رہا ہو ۔ وہ کراہنے لگا اور اپنے کراہنے پر خود حیران ہونے لگا۔ یہ کیسا کراہنا تھا؟ وہ تو اچھا بھلا تندرست اور توانا تھا مگر اس کراہنے میں ایک عجیب طرح کی راحت بھی تھی۔ وہ اس عجیب طرح کی راحت کو محسوس کرتے کرتے سو گیا۔ وہ سو تو گیا لیکن محسوس اسے یوں ہوا جیسے اس سے سویا نہیں جا رہا ہے۔

کسی نے آہستہ آہستہ دروازہ کھولا اور اسے صاف محسوس ہوا کہ دروازہ کھولنے والا اندر آ گیا ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کیا کسی کے یوں دبے پاؤں آنے سے آختہ کیے جانے کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے ؟ اس نے سوچنا چاہا مگر اس سے سوچا نہ گیا۔ وہ یوں بنا پڑا رہا جیسے سورہا ہو۔

اندر آنے والے نے دروازہ آہستہ سے بند کیا اور اسے صاف محسوس ہوا کہ کوئی پنجوں پر چلتا ہوا اس کے قریب آ رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ قریب آتا گیا بارش کے پہلے چھینٹے کے ساتھ اٹھنے والی سوندھی خوشبو بھی قریب آتی گئی۔ اسے کیا خبر تھی کہ خوشبو اس رات چوڑیاں اتار کر آئے گی۔

اگلی صبح اسرار دفتر نہیں گیا۔

میں بتاتا ہوں اسرار کہاں گیا۔

نالے کے دوسری طرف، پہاڑیوں کے دامن میں قبائلیوں کا جو ڈیرا ہے، وہ وہاں گیا۔ وہاں شادی بیاہ میں چلانے کے لیے اصلی بندوقیں کرائے پر ملتی تھیں۔ وہ بندوق کرائے پر لینے گیا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ بندوق کرائے پر دینے والے کبھی پوچھتے نہیں کہ بندوق کا کیا کرو گے، لیکن اس روز اس قبائلی نے اس سے پوچھا کہ بندوق کا کیا کرو گے؟

اس نے کہا، اور ہر لفظ کے معنی اچھی طرح سمجھتے ہوے کہا، چوہدری عبدالہادی کا آختہ۔"

٭٭

قیصرتمکین

ایک کہانی، گنگا جمنی

شکر یہ اس مظہر کمالات خداوندی کا جس کے وجود سراپا محمود نے بزم تاریک امکاں میں نورِ وحدت و شریعت کی تابناکی کو۔۔۔

پریتم آن ملو..."

لاحول ولاقوۃ! ابے کم بخت کون ہے؟ پریتم پر یستم لگائے ہے۔"

" یا ... آن ... ملو... .

"ابے چپ الو کے پٹھے ! ابھی آن ملتا ہوں تیری اناں سے ۔ " مرزا بیدار بخت اب واقعی زور سے غصے میں چلائے ۔ مگر جواب میں بالکل گھر کے دروازے پر ہی کسی نے ان کو پڑھانے کے لیے تان لگائی، یان آن ملو۔ اب مرزا بیدار بخت سے بالکل ضبط نہ ہو سکا۔ چاندی کی موٹھ والی ڈیڑھ گز لمبی لاٹھی اٹھائی، پیروں میں گر گابیاں ڈالیں اور باہر کی طرف چلے۔ بیوی نے راستا روکا اور بیٹی نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے کی کوشش کی۔ مگر مرزا کا غصہ اپنے شباب پر تھا۔ دونوں کو ایک طرف ڈھکیل کر لاٹھی ٹھونکتے یہ جا وہ جا۔

باہر نکل کر انھوں نے دیکھا اور بڑی بانگی سے لاٹھی ٹھونکی۔

چاندی والی گلی میں حسب معمول صبح کا شور شرا با دو پھر سے گلے مل رہا تھا۔ قلعی گر بر تنوں پر رانگے کے چمکتے چپلوں سے قلعی کرنے میں مصروف تھے۔ نیچی نیچی چھتوں والی اندھیری دوکانوں میں پتنگ بنانے والے اپنے فن کو آخری سنبھالا دینے کی کوشش میں مصروف تھے۔ گلی کے برا بر محلسرا کی لکھوری اینٹوں کی دیوار پر کھونٹیاں اور چرخیاں لا کر کنکووں کے لیے ڈور اور مانجھا بنا یا جا رہا تھا۔ میونسپلٹی کے موٹی دھار کے بمبے پر حافظ بشیر کی بیوہ ترکاریوں کا ڈھیر لگا ئے شلجم دھورہی تھی۔ بانکے لال کے کر یا نہ اسٹور پر ادھار آٹا دال مانگنے والی سیدا نیاں برقعے اوڑھے، نقاب الٹے، بھاری بھاری کولھوں پر ریں ریں کرتے اور ناک بہاتےبچے ٹکائے طرح طرح کے بہانے بنا رہی تھیں۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں مہین تار جیسے چاندی کے چھنے، ایک آدھ سونے کی بالی: ناک کی کیل یا کسی ننھی بچی کی چھوٹی سی چوڑی بھی تھی جس کو رہن رکھ کر وہ جو ملا آٹا یا دھان ملے کا کن جیسے چاول لے جانے کی فکر میں تھیں۔ یہ چاندی سونے کے چھلے محض نام کے لیے رہن رکھے جاتے کیوں کہ ایک بار اگر کوئی چیز بانکے لال کے " کریانہ "اسٹور پر رہن ہو جاتی تو پھر اس کو واپس چھڑانے کا کبھی کوئی سوال ہی نہ اٹھتا۔ برقعے والیاں خوشامد کر کے آٹا دال گھر لے جاتیں جہاں گیلی لکڑیاں پھونک کر ان کی آنکھیں سوج جاتیں، محض اس ڈر سے وہ اس عذاب میں مبتلا رہتیں کہ چراغ جلے جب روزی کمانے والا گھر پہنچے تو بھوکا نہ سو سکے۔

گلی کی چاؤں چاؤں میں نبی بخش زر کوب چاندی کا ورق کوٹے جا رہا تھا، جس سے ہمیشہ ایک . مخصوص زندگی بخش آہنگ بر پا رہتا۔ افتخار کسگر، عارف قلعی گر، اور عبداللہ شیرینی فروش کی دکانوں کے آگے پہنچ کر اس گلی کا روپ بدلنے لگتا۔ بڑی بڑی کھلی اور دو تین دروں والی دکانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا، جن میں چکن کامدانی بنانے والوں ، بزازوں اور انگریزی دوائیں بیچنے والوں اور پھر تانبے پیتل کے برتنوں کا کاروبار کرنے والوں کی دکانیں آتیں، اور ان کے بعد گلی کا ایک سرا کچھ اس طرح شہر کی بڑی سڑکی کے چورا ہے پر مل جاتا کہ منظر بدلنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔

چورا ہے پر موٹروں ، یکوں ، تانگوں، رکشوں اور سائیکل سواروں کے ہجوم میں پتا بھی نہ چلتا کہ اسی سڑک کے متوازی ایک نیم روشن، سیلی ہوئی، ٹھنڈی ٹھنڈی چاندی والی گلی بھی ہے جس کے وسط میں عالم ِدوراں اور فاضل اجل مرزا بیدار بخت کا غریب خانہ بھی ہے جہاں وہ عصر ِحاضر کا تاریخ ساز صحیفہ رقم فرمانے میں مصروف ہیں اور اندر گھر میں ان کی بیگم اور بیٹی پرانے دنوں کے کامدانی کے دوپٹوں سے چاندی کے تار کھینچ کھینچ کر چولہا گرم کرنے کی کسی نئی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

مرزا بیدار بخت نے شرر بار نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ان کو " پر یستم آن ملو" کی دعوت دینے والا تو کوئی نہ دکھائی دیا ، ہاں افتخار کسگر اور نبی بخش زر کوب کی دکانوں سے پرے وہ بڑا لنگوری بندر خوخیا تا نظر آیا جس کے بارے میں آج کل گلی میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ بندر کا منہ خاکی رنگ کا تھا۔ اس کی دم بے تحاشا لمبی تھی۔ یہ بندر گلی کے سُناروں کے لڑکوں نے پالا تھا اور اس کا خاص کام میاں لوگوں کی پگڑی اچھالنا تھا۔ ابھی کوئی ہفتہ دس دن پہلے اس نے مولوی حقی کی بڑی بری گت بنائی تھی۔

مولوی حقی اپنی گھنی داڑھی مونچھوں کے بیچ میں ایک پائپ کھونے رہتے تھے۔ وہ محکمہ اطلاعات میں اخبارات پڑھنے، ان کے تراشے نکال کر اپنے تبصروں کے ساتھ متعلقہ شعبوں اور افسروں کو بھیجنے کی خدمت پر مامور تھے۔ ان کی حیثیت آ پر ڈویژن کلرک کی تھی ، مگر وہ اپنے کو ادب اسلامی کا دانشور بھی کھلاتے، چنانچہ ہر وقت منہ میں پائپ دبائے رہتے۔ یہ پائپ عام طور پر بجھا ہی رہتا، کیوں کہ کثیر العیالی کی بنا پر وہ مہینے میں صرف ایک ہی ڈبا اپنی جماعت کے رفیق ٹیڈی ملا کی دکان سے حاصل کرنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ اس ڈبے کو وہ بہت کفایت سے استعمال کرتے۔ وہ سائیکل ہاتھ میں پکڑے پکڑے گلی طے کرتے اور سُناروں کے علاقے میں داخل ہوتے ہی اس پر بیٹھتے، اور ریاستی سکرٹیریٹ کی طرف روانہ ہوتے۔ لنگوری بندر نے کئی بار دور ہی دور سے مولوی حقی کو دھمکایا اور چڑھا یا بھی ، مگر وہ اپنی آبرو بچا کر نکال لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ حال ہی میں بندر نے مولوی حقی کی نقل میں ایک لال گاجر منہ میں لگالی۔ سناروں کے لڑکے خوب ہنسے، اور طرح طرح کے آوازے کے، جن کا مطلب تو مولوی حقی خوب سمجھتے تھے، مگر بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی بنا پر وہ کوئی اعتراض کر سکتے۔

مولوی حقی نے پائپ منہ میں لگا یا اور سائیکل پر سوار ہونے ہی کو تھے کہ لنگوری بندر نے اچھل کر ان پر حملہ کیا اور معلوم نہیں کس مہارت سے ان کا پائپ چھین کر الگ کھڑا ہو گیا، اور مولوی حقی ہی کی طرح پائپ منہ میں لگا کر انھیں کے حلقے کا چھوٹا موٹا دانشور نظر آنے لگا۔ مولوی حقی نے کچھ کہنا چاہا تو بندر دُم اس طرح گھمائی کہ مولوی حقی کے ہاتھ سے سائیکل چھٹ گئی اور وہ گھبرا کر ایک طرف ہوگئے ۔ سائیکل کی کئی تیلیاں ٹوٹ گئیں۔

دو ایک قلعی گر، کنکو بنانے والے اوع کگروجلدی سے آئے اور مولوی حقی کو دلاسا دینے لگے: اِجی چھوڑیے مولوی صاحب ، یہ لیجیے، سائیکل سنبھالیے ۔اِجی اپنی راہ نکلیے ۔ بے فائدہ بے فضول میں اپنی بے عزتی خراب کرنے سے کیا فائدہ۔"

مولوی حقی اپنا بایاں گھٹنا جھاڑتے غم وغصے کے احساس کے ساتھ سائیکل پکڑے پکڑے پیدل ہی دفتر چل دیے۔

یہ واقعہ مرزا بیدار بخت کے گھر میں کئی عورتوں کا موضوع گفتگو رہا تھا۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ اس لنگوری بندر کی وجہ سے شریفوں کا اس گلی سے گزرنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔ یہ بندر روز ہی کسی نہ کسی میاں بھائی کی گت بنا ڈالتا۔ خاص طور پر برقعے والیوں اور پردے دار عور توں پر اس طرح جھپٹتا کہ اچھے اچھے گھرانوں کی سید زادیاں بے پردہ ہو کر بھاگنے اور گڑ گڑانے کے سوا کچھ نہ کر پاتیں۔ اس دن جب کسی نے بے فکری میں " پریتم آن ملو" کی راگنی آلاپی تو مرزا خفا ہو کر باہر نکل آئے۔ ان کو " پریتم آن ملو" کی دعوت دینے والا نظر نہ آیا، ہاں لنگوری بندر ان کو دیکھ کر ضرور خوخیانے لگا۔ مرزا کا حلیہ بھی کچھ ایسا تھا کہ ہر شخص کی نظر ان پر پڑ رہی تھی۔ بندر نے ان کو دھمکانے کے لیے جو خوخیانا شروع کیا تو مرزا اکڑ کر آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ بندر نے ان کا چیلنج قبول کر لیا اور گھما کر اپنی ڈم سونٹے کی طرح ماری۔ مرزا بیدار بخت چل کر ایک طرف ہو گئے اور اپنی جوانی کے زمانے کا ہاتھ دکھاتے ہوے گھما کر جو لاٹھی ماری تو بندر کا دماغ شل ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور اس کی ناک سے خون کی دھار یں نکلنے لگیں۔

"ہائے رام گجب ہوئی گوا ! " کئی لوگوں نے سنسنی خیز لہجوں میں آواز میں لگائیں۔ لالہ دھونی چند دھوتی سنبھالتے آگے بڑھے، مگر تب تک مرزا بیدار بخت نے دو ہاتھ اور جڑ دیے۔ بندر کا بھیجا پھٹ گیا اور وہ وہیں تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

ہائے رے! دیارے ! کا کر ڈالیو مرجا جی... گلی کی کھٹک عور تیں سناٹے میں آ گئیں۔ رام رام رام... ہتیاہوئے گئی... ہنومان ہتیا ہوئے گئی ! " صرافوں کے شیطان لڑکے وحشت زدہ لہجوں میں چلانےچیخنے لگے۔ پوری گلی میں سنسنی پھیل گئی۔ ”ارے مرزا صاحب، کیا غضب کر دیا ! " افتخار کسگر، عارف قلعی گر اور رام لال کہار مرزا کو ایک طرف کھینچنے لگے۔ مگر تب تک مرزا بیدار بنت غصے میں بے قابو ہو چکے تھے، اور فحش گالیاں بکنے لگے تھے۔ اب کے اگر کوئی مادر چود حرامی پن کرے گا تو سالے کے چوتڑوں میں یہی لاٹھی نہ گھسیڑ دوں تو میں بھی اصل مغل بچہ نہیں..."

یہ مغلیہ آن بان دیکھ کر مافی لال کے لڑکے نے "ہر ہر مہادیو "کا نعرہ لگا دیا۔ جواب میں برا بر بڑھتے ہوے مجمے نے “ جے ہنومان کی " اور " بھارت ماتا کی جے“ کے نعرے لگائے۔

سنُاروں کے لڑکوں نے داڑھی والوں ، چو گوشیہ ٹوپی والوں، اور تہمد و پاجامہ پوش لوگوں کی گھونسوں، لاتوں، اور مگوں سے تواضع شروع کر دی۔ بعض ویر جوانوں نے پلنگ کے پایوں اور پٹیوں سے بھی میاں لوگوں کی مرمت میں دلچسپی لی۔ تب تک پوری گلی میں دھڑادھڑ دکانیں بند ہونے لگیں۔

علی جانی کر بلائی کے تعزیے، ضریح اور علم باہر رکھے تھے۔ اس نے ڈر کے مارے گھبرا کر ان کو دکان کے اندر رکھنا شروع کیا تو سیتارام کھرے اور مانی لال کے لڑکے ان پر گو بر اور جوتے پھینکنے لگے۔ علی جانی کر بلائی کا جوش ایمان جلال پر آ گیا، اور اس نے " یا علی مکہہ کر درگا تنبولی کے نوجوان بیٹے کے سینے میں قرولی بھونک دی۔ سولہ سترہ برس کے خوب رو جوان کا خون دیکھ کر سیوا دل کےنویوو کوں کو جوش آ گیا، اور بالکل جادوئی طریقے پر ہر طرف سے چاقو چھریاں نکل آئیں جو حال ہی میں پردیش کانگرس کے پردھان، شری آمرت لال گنتھے، نے نوجوانوں کو پاکستانی جاسوسوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بانٹی تھیں۔

چُھری چاقو کے استعمال سے فساد پورے رنگ پر آ گیا۔ پنالال کے پل پر بنی ہوئی پولیس چوکی پر تعینات پی اے سی کے بہادر جوان ایک ہی ریلے میں گُھس آئے، اور انھوں نے میاں جی لوگوں کے پاجامے اور تہمد میں اُتار اُتار کر اچھی طرح دھنائی شروع کر دی۔ میاں جی لوگوں کے حلیے اس طرح بگڑ گئے کہ ان کی مائیں بھی ان کو نہ پہچان سکتیں۔ پی اے سی کے بہادر جوانوں کو دیکھ کر رام لال کے لڑکوں ، کھرے بابو کے چیلوں، اور نارنگ جی کے نویوو کوں کو اطمینان ہوا۔ انھوں نے مٹی کے تیل کے ڈبے لالا کر میاں لوگوں کی دکانوں پر چھڑکنا شروع کیا۔ تین بجتے بجتے چاندی والی گلی کا ایک حصہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ تب تک آکاش وانی نے اپنی قومی خبروں میں اعلان کر دیا کہ خانپور شہر میں پاکستانی گھس بیٹھیوں نے گڑبڑ کی جس سے دو گھس بیٹھیے مارے گئے۔"

دوسرے دن اسی جلی اور جھلسی ہوئی چاندی والی گلی میں ایک بڑا سا لال کپڑا بچھا تھا جس پر لنگور کی لاش پڑی تھی۔ اس کے آس پاس کھرے کھوٹے سکوں کا ڈھیر تھا۔ لاش کے سرھانے دھوپ جل رہی تھی۔ ہنومان جی کے بیجاری دور دور سے آ کر کپڑے پر پیسے ڈال رہے تھے۔ ظہور تمبا کو والے نے پورا سو کا نوٹ احتیاط سے بندر کی لاش کے سرھانے رکھا اور ادب سے دونوں ہاتھ جوڑ کر وہاں سے منہ ہی منہ میں دعائیں پڑھتا ہوا ہٹ گیا۔

افتخار کسگر اور عارف قلعی گر کی جلی ہوئی دکانوں کے سامنے چار پائیاں پڑی تھیں، جن پر پی اے سی کے بہادر جوان بیٹھے تھے۔ ان کی پگڑیاں اور لوہے کے ٹوپ چار پائیوں کے سرھانے دھرے تھے ،او وہ خود اس طرح بیٹھے تھے کہ ٹانگوں کے بیچ میں سنگین لگی بندوقیں اور لاٹھیاں کھڑی تھیں۔ پی اے سی کے بہادر جوان مونچھیں مروڑ کر پیتل کے چمکتے گلاسوں میں دودھ اور بادام میں کھٹی ہوئی بھانگ پی رہے تھے جو پردیش کانگرس کے پردھان ، شهر ی آمرت لال گنتھے، کے گھر سے برا بر بھیجی جارہی تھی۔

۲

دو گھس بیٹھیے مارے گئے؟"

تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز نے، جو اردو ادب میں گنگا جمنی قدروں کی علم بردار تھیں،متعجب ہو کر خود سے سوال کیا۔

تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز کو نہ فساد کا ڈر تھا اور نہ آگ لگنے کا خوف ۔ جس دن ہنومان ہتیا ہوئی، وہ اطمینان سے بی بی کے حجرے میں حالات کا مشاہدہ کر رہی تھیں ، اور ان کے شوہر مزے سے ہندی ساہتیہ گوشٹھی کے کاریالیہ میں بیٹھے اردو "بولی “ کی لپی بد لے جانے کے بارے میں کسی نوین و چار دھارا کی چرچا میں مصروف تھے۔

تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز، بی بی کے حجرے میں محفوظ تھیں۔ یہ حجرہ موکھم چندر کھیم جی کی کوٹھی کا حصہ تھا جس کی کھڑکیاں سڑک اور گلی دونوں طرف کھلتی تھیں۔ اس کے باوجود مو کھم چندر کھیم جی کی کوٹھی پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی تھی۔ یکاتانگا یونین کے پریشان حال اور تلخ نیتا شهر یمالی جی کا کہنا تھا کہ "یدی بھگوان سویم اپنے ہاتھ سے سنسار کو ناش کرنا چاہیں تو وہ بھی موکھم چندر کھیم جی کی کوٹھی کے بارے میں وہار جرور کر یں گے۔"

موکھم چندر کھیم جی کی کوٹھی کا بالائی حصہ ہوائی جہاز کی شکل کا تھا۔ اگر دو تین میل کی دوری سے دیکھا جاتا تو یہی لگتا جیسے چھت پر کوئی جمبوجٹ کھڑا ہے۔ اس کے نیچے کئی حصے تھے۔ ایک حصہ بی بی کا حجرہ کہلاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موکھم چندر کھیم جی جب چار باغ اسٹیشن کی ریلوے ورک شاپ میں کام کرتے تھے تو ایک بار انجنوں اور مشینوں کے بیچ میں اس طرح پھنس گئے کہ زندہ بچنا ناممکن تھا۔ معلوم نہیں کیوں ان کے منہ سے نکلا یا بی بی سیدہ مدد! خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بجلی فیل ہو گئی، جس سے ساری مشینیں ٹھپ ہو گئیں، اور موکھم چندر کھیم جی بچ نکلے ۔ ذرا سی خراش بھی تو نہ آئی۔ اس کے بعد موکھم چندر کھیم جی کے گھر والوں کو ایسا اعتقاد ہو گیا کہ ان کے دیہانت کے بعد ان کی اولاد نے بھی کوٹھی میں علم اور تعزیے رکھنے کی روایت برقرار رکھی۔ کوٹھی کا ایک حصہ اس کے لیے وقف رہتا، اور اس حصے کو جسے بی بی کے حجرے کا نام دیا گیا، ایک کھرے سید گھرانے کے لیے وقف کر دیا گیا۔ آج کل اس امام باڑہ نما حجرے میں تحسین باجی عرف ثریا شملا ناز مقیم تھیں، جن کو نان نفقہ چھوڑ کر پاندان اور میوہ خوری کے لیے دو سو روپے نقد سیٹھ جی کے ذاتی اخراجات کی مد سے ملتے۔

تو جب آکاش وانی نے راشٹریہ سماچار میں گھوشنا کی کہ دو پاکستانی گھس بیٹھیے مارے گئے تو تحسین باجی عرف ثریا شہلاناز اپنی گنگا جمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کی اونچی لے کے باوجود ذرا سوچ میں پڑ گئیں۔ فساد کا تماشا دیکھتے ہوے انھوں نے خود گنا تھا ۔ گیارہ مردے تو صرف ایک ٹرک میں ڈالے گئے تھے۔ وہ سب پاکستانی گھس بیٹھے تھے کیوں کہ سب کے نچلے بدن ننگے تھے اور ایک مردے کی ننگی ٹانگوں پر کالے پڑتے ہوے بھورے خون کے ساتھہ پتلا پتلا گو بھی جما ہوا تھا۔ شاید اس گھس بیٹھیے پر جام شہادت پیتے وقت اللہ کا خوف بھی طاری ہو گیا تھا۔

فساد کی لہر دھوں دھوں ، کالے کالے دھویں کے مرغولوں ، اور مار ماری کے ہنگامے میں کسی کا بھی دھیان بی بی کے حجرے کی طرف نہیں گیا جہاں تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز گن رہی تھیں : ایک... دو... تین....

گیارہ تک کی گنتی تو ان کو یاد تھی۔ کتنے لوگ زخمی ہوے تھے اور ان کا کیا حشر ہوا، اس بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز سوچ رہی تھیں تو یہ کہ وہ جب اس فساد کے بارے میں کہانی لکھیں گی تو کیسے؟ گیارہ پاکستانی گھس بیٹھیوں کی لاشیں تو انھوں نے خود گنی تھیں۔ اس کے مقابلے میں دیش سیوکوں کی ایک بھی آر تھی نہیں اٹھی تھی۔ صرف ایک ڈر کا تنبولی کا بیٹا شاردا ہی بری طرح گھائل ہوا تھا۔ جب تک گھس بیٹھیوں کے ہاتھوں دیش سیوکوں کی بپتا کا حال اچھی طرح نہ بیان کیا جائے ،کہانی میں " بیلینس " نہیں پیدا ہو گا۔ ہندی ساہتیہ کاروں اور اپنیاس لکھنے والوں کو اگر اس توازن ، معاف کیجیے، بیلینس کا خیال نہ ہو تو نہ سہی، پر اردو کہانی میں جب تک یہ بیلینس “ نہ ہو، اس کو نہ تو گنگا جمنی تہذیب مانا جائے گا اور نہ ترقی پسندی کی سنَد مل سکے گی۔

سوچتے سوچتے تحسین باجی عرف ثریا شہلاناز اس نتیجے پر پہنچیں کہ اتنے بڑے فساد کے بارے میں ایک کہانی لکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے بارے میں تو پورا ناول لکھنا چاہیے؛ اس میں پھر اچھی طرح توازن ، معاف کیجیے گا، " بیلینس “ کر دیا جائے گا۔

" سوتنتر دیش" کے سمپادگ شری کملیش میشر نے فساد پر تبصرہ کرتے ہوے سناروں کے لڑکوں کی کڑی آلوچنا کی کہ انھوں نے بیچ گلی میں لنگوری بندر پال کر شریفوں کی آمد ورفت دشوار کر دی تھی۔ شری کملیش مشر نے لکھا کہ ہنومان جی تو سچائی کا پالن کرنے اور سچوں کی مدد کرنے کے لیے آئے تھے؛ اس طرح کی گنڈا گردی تو ان کا اپمان کرنا ہے۔

شری کملیش مشر کے تبصرے کو پڑھ کر شمشیر سلجوقی، ڈی لٹ، بہت خوش ہوے۔ انھوں نے شری کملیش مشر کے سپوت شہری اکملیش میشر کو عربی زبان و ادب میں سو میں سے ایک سو دس اعزازی نمبر دیے۔ اس کے علاوہ ان کو ایک طلائی تمغا بھی عطا ہوا جس کے بعد قاہرہ کے ہندوستانی سفارت خانے میں شہری اکملیش مشر کی تقرری پکی ہو گئی۔

۳

چاندی والی گلی میں میاں لوگوں کے اندھیرے، پرانے، سیلے، اور پھُر بھری مٹی کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر مائل انهدام مکانات جب جبل چکے اور ملبہ صاف کیا جا چکا، اور وہاں نئی بستی بسانے کا ٹھیکا حکم چند مولی چند بنتھیا کو مل چکا، تو پنڈت کیلاش ناتھ خزاں اور منشی پیارے لال غمزدہ نے تحسین باجی عرف ثریا شہلا ناز کے تعاون سے ایک قومی یکجہتی مشاعرے کا انتظام کیا جس میں پاکستان سے سیاسی پناہ کی تلاش میں آئے ہوے ادیبوں اور شاعروں نے بھر پور حصہ لیا۔ صدارت مولوی گنگا پرشاد مد فی، فاضل دیوبند، نے کی۔ حضرت بے پایاں سمندری نے مرحوم لنگور کی موت پر ایک حسرت ناک و اندوہ ناک مرثیہ پڑھا۔ مفتی صبغت اللہ حجازی نے کہا کہ چوں کہ سائنس اور انتھروپولوجی کی رو سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ ہنومان جی انسانوں کے مورث اعلیٰ تھے، اس لیے میں نے آج تک جو بھی قرآن کریم پڑھا ہے اس کا ثواب مرحوم لنگور کی روح کو بخشتا ہوں ۔

پوری محفل جذبہ اتحاد، قومی یکجہتی، اور رواداری کے جذبے سے سرشار ہو گئی۔ پاکستانی ادیبوں اور شاعروں نے حسرت کا اظہار کرتے ہوے کہا، "افسوس، ہمارے ملک میں یہ وسیع النظری پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

" وہاں تو اسلام بیٹھا ہوا ہے، سنجیدہ نیازی نے حقارت اور طنز سے آواز بڑھاتے ہوے کہا، پھر رتن سنگھ ڈھینگرہ کی گود میں بیٹھ کر ڈائرمیکن کی "سولن "منہ سے لگالی۔

( یہ شکریہ Annual of Urdu Studies ، میڈیسن ، وسکانسن ، یوایس اے۔ )

**و بھوتی نراین رائے**

و بھوتی نراین رائے ہندی کے منفرد ادیب ہیں۔ وہ ۲۸ نومبر ۱۹۵۰ کو پیدا ہوے اور بنارس اور اللہ آباد میں تعلیم پائی۔ انھوں نے ۱۹۷۱ میں الہ آباد یو نیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور ۱۹۷۵ میں انڈین پولیس سروس میں منتخب ہوے۔ ان کے کئی ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ الہ آباد سے شائع ہونے والے ہندی ادبی ماہ نامہ اور تمان " کے مدیر بھی ہیں۔ ان کا مختصر ناول "شہر میں کرفیو"، جس کا ترجمہ اگلے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر لکھی گئی بے باک اور عمدہ تحریروں میں سے ایک ہے اور خاصا موضوع بحث رہا ہے۔ اس ترجمے کے لیے ہم سہ ماہی "ارتقا ، کراچی، کے ممنون ہیں۔

**و بھوتی نراین رائے**

ہندی سے ترجمہ : وقار ناصری

**شہر میں کرفیو**

شہر میں کرفیو اچانک نہیں لگا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے شہر کا وہ حصہ جہاں ہر دوسرے تیسرے برس کرفیو لگ جایا کرتا ہے، اس کے لیے جسمانی اور ذہنی طور پر اپنے کو تیار کر رہا تھا۔ پوری فضا میں ایک خاص طرح کی سنسنی تھی اور سنسنی کو سونگھ کر پہچاننے والے تجربہ کار لوگ جانتے تھے کہ جلد ہی شہر میں کرفیو لگ جائے گا۔ انھیں صرف اس بات پر حیرت تھی کہ آخر پچھلے ایک ہفتے سے کرفیو ٹلتا کیسے جا رہا تھا۔ بلوا قریب ڈیڑھ بجے شروع ہوا۔ پونے دو بجتے بجتےپولیس کی گاڑیاں لاؤڈ اسپیکروں پر کرفیو لگنے کا اعلان کرتی گھومنے لگی تھیں، حالاں کہ کرفیو کا اعلان محض رسمی سا تھا کیوں کہ پندرہ منٹ میں خلد آباد کی سبزی منڈی سے لے کر بہادر گنج تک، جی ٹی روڈ پوری طرح سے خالی ہو گئی تھی۔ اکادکا دکان دار اور افراتفری میں اپنے مردوں سے بچھڑی عورتیں ہی بد حواس سی جی ٹی روڈ پر بھاگ رہی تھیں۔ اگست کے آخری ہفتے میں ہوے اس فساد کا رہر سل جون میں ہو چکا تھا، لہذا لوگوں کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ ایسے موقعوں پر کیا کیا جانا چاہیے۔

انھیں پتا تھا ایسے موقع پر سب سے پہلا کام دکانوں کے شٹر گراتے ہوے اپنی سائیکلیں، چپل، جھولے سڑکوں پر چھوڑتے ہوے گلی گلی اپنے گھروں کو بھاگنے کی کوشش کرنا تھا۔ انھوں نے یہی کیا اور تھوڑی ہی دیر میں جی ٹی روڈ، کاٹجو روڈ، مرزا غالب روڈ اور نور اللہ روڈ جیسی سڑکیں ویران ہو گئیں۔ صرف گلیوں کے دہانوں پر لوگوں کے جھنڈ کھڑے تھے جو پولیس کے آنے پر اندر بھاگ جاتے اور پولیس کےہٹتے ہی پھر واپس اپنی جگہ پر آجاتے۔ شاہ گنج پولیس چوکی کے پیچھے منہاج پور اور منصور پارک کے پیچھے گلاب باڑی کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں کافی تیزی سے آ رہی تھیں۔ ان کے علاوہ پھٹ پٹ آوازیں گلیوں سے یا اکبر پور، نہال پور اور مرزا غالب روڈ سے آ رہی تھیں۔ دو بجتے بجتے فوج بھی شہر میں آ گئی اور اس نے شاہ گنج، نور اللہ روڈ اور شوکت علی مارگ پر پوزیشن لے لی۔ ڈھائی بجے تک ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی جس نے جلد ہی موسلادھار بارش کا رنگ اختیار کر لیا اور اس بارش نے سب کچھ شانت کر دیا۔ تین بجے تک کھیل ختم ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے تھے۔

باہر سڑک پر صرف خون تھا، پولیس تھی، اور اگست کی سڑی گرمی سے نجات دلانے والی موسلادھار بارش تھی۔

کل ملا کر ڈیڑھ گھنٹے میں جو کچھ ہوا، اس میں چھ لوگ مارے گئے، تیس چالیس لوگ زخمی ہوے اور تقریباً تین سو لوگ گرفتار کیے گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے چیل کی طرح آسمان میں منڈلانے والے ایک طوفان نے یکا یک نیچے جھپٹا مار کر شہر کو اپنے نوکیلے پنجوں میں دبوچ کر نوچ کھسوٹ ڈالا ہو اور پھر اسے پنجوں میں پھنسا کر کافی اوپر اٹھ گیا ہو، اور اوپر لے جا کر اسے ایک دم سے نیچے پٹک دیا ہو۔ شہر بری طرح سے لہولہان پڑا تھا اور ڈیڑھ گھنٹے کے حادثے نے اس کے جسم کا جو حال کیا تھا اسے ٹھیک ہونے میں کئی مہینے لگنے تھے۔

ہوا کچھ ایسا کہ قریب ڈیڑھ بجے دن میں تین چار لڑکے مرزا غالب روڈ، جی ٹی روڈ کراسنگ پر بینک آف بڑودا کے پاس ایک گلی سے نکلے اور گاڑی بان ٹولے کے پاس ایک مندر کی دیوار پر بم پھینک کر واپس اسی گلی میں بھاگ گئے۔ جو چیز دیوار پر پھینکی گئی وہ بم کم پٹاخا زیادہ تھی۔ اس سے صرف تیز آواز ہوئی، کوئی زخمی نہیں ہوا۔ بم چوں کہ مندر کی دیوار پر پھینکا گیا تھا اس لیے اس وقت وہاں موجود ہندوؤں نے مان لیا کہ بم پھینکنے والے مسلمان رہے ہوں گے، اس لیے انھوں نے ایک دم وہاں سے گزرنے والے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ سب سے پہلے ایک موٹر سائیکل پر جانے والے تین لوگوں پر حملہ کیا گیا۔ ان میں سے ایک، موٹر سائیکل سے گرتے ہی، کود کر بھاگ گیا۔ باقی دو زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے اور سر کو دونوں ہاتھوں سے ڈھکے اس وقت تک لاتیں ، گھونسے اور ڈھیلے کھاتے رہے جب تک پاس میں احمد گنج میں تعینات پولیس کی ایک ٹکڑی وہاں پہنچ نہیں گئی۔ اس کے علاوہ بھی ادھر سے گزرنے والے کئی لوگ پٹے۔ تقریباً اسی کے ساتھ مرزا غالب روڈ پر صبح سے جگہ جگہ اکھٹے برافروختہ مجمعے نے اس سڑک پر تعینات پولیس کی چھوٹی ٹکڑیوں پر حملہ کر دیا۔ ان ٹکڑیوں میں دو تین سول پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ چار چار پانچ پانچ سوم گارڈ کے جوان تھے۔ تھوڑی دیر میں کافی تعداد میں پولیس اور ہوم گارڈ کے جوان مرزا غالب روڈ سے گاڑی بان ٹولے کی طرف بھاگتے دکھائی دینے لگے۔ گلیوں کے منہ پر کھڑے حملہ آور نوجوانوں اور لڑکوں کی بھیڑ کے پتھروں سے بچنے کے لیے اپنے ہاتھ سے چہرہ بچائے، وہ بینک آف بڑودا کی طرف بھاگ رہے تھے جہاں احمد گنج سے پی اے سی اور پولیس کی ایک ٹکڑی پہنچ چکی تھی۔ ان بھاگنے والے سپاہیوں میں سے ایک بینک آف بڑودا سے قریب ایک فرلانگ پہلے ہی گر پڑا۔ اسے ایک بم لگ گیا تھا اور کانچ کی نکیلی کر چیں اس کے چہرے میں بھر گئی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھکے بھاگ رہا تھا۔ اچانک ایک گلی کے منہ پر بد حواسی میں ایک دم سڑک کے کنارے چلا گیا اور وہاں لڑکوں کی بھیڑ سے ٹکراتے ہوے اس نے بیچ سڑک پر آنے کی کوشش کی کہ تبھی ایک مچھرا اس کی بائیں پسلیوں پر لگا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا بیچ سڑک پر گر پڑا۔

قریب قریب ایک ساتھ کئی جگہوں پر بم پھینکنے اور فائرنگ کی وارداتیں ہوئیں۔ لگتا تھا جیسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت کوئی ان دیکھا ہاتھ ان سارے حادثوں کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ قریب قریب سبھی جگہوں پر بم پھینکے گئے۔ بم یا فائرنگ میں کوئی زخمی نہیں ہوا۔ ان کا مقصد صرف دہشت پیدا کر کے ایک خاص قسم کی سراسیمگی پھیلانا لگتا تھا اور اس میں انہیں کافی حدتک کامیابی بھی ہوئی۔

پچھلے دو تین دنوں سے یہ بات ہوا میں تیر رہی تھی کہ مسلمان پولیس پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں اور تقریباً یہی ڈر پولیس کے سپاہیوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ صوبے کے پچھمی علاقوں میں کچھ جھگڑے ہوے تھے جن میں کافی مسلمان پولیس کی گولیوں سے مارے گئے تھے، اس لیے مسلمانوں کے دلوں میں غصہ بھرا تھا اور اس طرح کا پرچار کیا جا رہا تھا کہ مسلمان اگر اپنے محلےمیں اکاد کا سپاہیوں کو پا جائیں گے تو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے مسلم علاقوں میں اکاد کا سپاہیوں نے دو تین دن سے جانا چھوڑ دیا تھا۔ ضرورت پڑنے پر ہتھیار بند سپاہی اور داروغہ چار چار پانچ پانچ کی تعداد میں ان علاقوں میں جاتے تھے۔

ایک ساتھ کئی جگہوں پر پولیس پر بم پھینکنے اور فائرنگ کی جو وارداتیں ہوئیں ان میں زیادہ تر جگہوں پر کوئی زخمی نہیں ہوا۔ اکثر بم پھینکے جانے والے مقامات پر پولیس کھلے میں ہوئی اور بم ہمیشہ دس پندرہ گز دائیں بائیں کسی دیوار پر پھونکا جاتا جس سے زخمی کوئی نہ ہوتا لیکن مان لیا جاتا کہ اسے مسلمانوں نے پھینکا ہو گا، اس لیے فوراً اس علاقے کے سبھی مسلمان گھروں کی تلاشی لی جاتی۔ زیادہ تر مقامات پر کچھ بر آمد نہ ہوتا؛ کچھ مقامات سے گوشت کاٹنے کے چھرے یا تھانے میں جمع کرنے کے حکم کے باوجود گھروں میں پڑے لائسنسی اسلحہ بر آمد ہوتے اور گھر کے مرد ۲۵ آرمز ایکٹ یا دفعہ ۱۹۹ میں گرفتار کر لیے جاتے۔

تین بجے جب بارش تھمی تو اس نے شہر کو اگست کی سڑی گرمی کے ساتھ ساتھ تناو سےبھی فوری طور پر نجات دلادی۔ پکنک اور رومانس حاصل کرنے کے ارادے سے پولیس کی گاڑیوں پر نکلے صحافیوں کو بڑی مایوسی ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ شہر کی سڑکیں سونی پڑی ہیں۔ لوگ گھروں میں تھے۔ سڑکوں پر پولیس کی بدحواس گاڑیاں تھیں، اور تناو چا ہے کہیں رہا ہو فی الحال سڑکوں سے غیر حاضر تھا۔

بارش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ دو تین سمتوں سے پولیس کی گاڑیاں آ کر شاہ گنج پولیس چوکی کے پاس رُکیں۔ اس وقت تک فوج نے چوکی کے آس پاس پوزیشن لینی شروع کر دی تھی۔ چوکی کے اندر سے کچھ سپاہی باہر جھانک رہے تھے اور چو کی کے آس پاس اور سامنے آنکھوں کے اسپتال اور نرسنگ ہاسٹل تک بالکل سناٹا تھا۔ بارش کا زور کچھ تھما ضرور تھالیکن بیچ بیچ میں تیز ہو جانے والی بارش پورے ماحول کو پراسرار خاموشی میں تبدیل کر رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں فائرنگ ہوئی تھی اور فائرنگ ختم ہونے کے فوراً بعد والا تناو پورے ماحول میں گھل مل گیا تھا۔

پولیس کی گاڑیوں سے دو ایس پی، ایک ڈی ایس پی، کچھ انسپکٹر اور سب انسپکٹر اترے۔ ان میں سے ایک دو نے چوکی کے پاس کی عمارتوں کے برآمدے میں بارش سے بچنے کے لیے پناہ لینے کی کوشش کی لیکن زیادہ تر لوگوں نے چوکی کے سامنے سڑک پر ایک گھیرا بنا لیا اور اگلی کارروائی کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ انھیں کنٹرول روم سے وہاں ہونے والی فائرنگ کی اطلاع ملی تھی۔ انھیں سڑک پر دیکھ کر چو کی میں چھپے ہوے اکاد کا سپاہی بھی قریب آگئے ۔ سبھی کے جسم تیز پانی کی بوچھار سے بھیگے ہوے تھے۔

جوشیلے لہجے میں ایک دوسرے کی بات کاٹتے ہوے سپاہیوں نے جو بتا یا اس کا مطلب یہ تھا کہ بیس منٹ پہلے وہاں فائرنگ ہوئی تھی، پولیس پر زبردست پتھراؤ ہوا تھا اور پولیس نے ایک عمارت کی چھت پر چڑھ کر فائرنگ کی تھی۔ چوکی کے پیچھے ملی جلی آبادی تھی اور کچھ دیر پہلے گلیوں سے چیخنے چلانے کی آواز یں آئی تھیں۔ اس وقت کوئی آواز نہیں آرہی تھی لیکن انہیں پورا یقین تھا کہ پیچھے کچھ گھروں پر حملہ ہوا ہے۔

لے یہ ہوا کہ اندر گھس کر دیکھا جائے؛ باہر سڑک پر کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اندر گلی میں ایک بھی آدمی مارا گیا یا کسی گھر میں آگ لگائی گئی تو اس کے نتائج کافی خطر ناک ہو سکتے تھے۔ ابھی تک وارداتوں کا رخ ایسا نہیں تھا جس سے کسی غیر معمولی فرقہ وارانہ فساد کا شک کیا جا سکے، لیکن ایک بار گلیوں میں آتش زنی یا چاقو بازی کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو اسے روکنا مشکل ہوجاتا۔

دونوں ایس پی تھوڑی دیر تک آپس میں صلاح مشورے کرتے رہے، پھر ایک جھٹکے سے وہ گلی میں گھسے۔ ان کے پیچھے پی اے سی اور پولیس کا جتھا تھا۔ منہاج پور ایک پارک کے چاروں طرف بسا ہوا محلہ تھا جس میں کھاتے پیتے مسلمانوں کے دو منزلہ سہ منزلہ مکان تھے۔ دوسرے مسلمان علاقوں کی غریبی اور گندگی سے یہ علاقہ پاک صاف تھا۔

موسلادھار بارش اور دہشت زدہ سناٹے نے ایسا ماحول بنا دیا تھا کہ پولیس اور پی اے سی کے جوان اپنے بوٹوں کی آواز سے خود بیچ بیچ میں چونک جاتے تھے۔ سارے انسپکٹروں اور سب انسپکٹروں کے ہاتھوں میں ریوالور یا پستولیں تھیں اور سپاہیوں کے ہاتھوں میں رائفلیں۔ سب نے اپنے ہتھیار مکانوں کی طرف تان رکھے تھے ۔ ہر مکان کےچھجے پر دشمن نظر آرہا تھا۔ سب کی انگلیاں گھوڑوں پر کسی ہوئی تھیں اور جوش میں کسی لمحے کوئی بھی انگلی ٹر ِگر پر ضروری دباو ڈال کر ایسی صورت حال پیدا کر سکتی تھی جس سے فائر ہو جائے۔ بیچ بیچ میں ٹھہر کر افسر لوگ پھسپھسا کر جوانوں کو رائفلوں کی نالوں کا رخ ہوا میں رکھنے کا حکم دے رہے تھے۔ وہ مکانوں کے برآمدوں اور کھمبوں کی آڑ لے کر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ ڈرے ہوے لوگوں کا جھنڈ تھا اور ہر آدمی نے اپنے دل میں ایک خیالی دشمن گڑھ رکھا تھا جو اسے مکانوں کے چھجوں یا گلیوں کے دہانوں پر دکھائی پڑ جاتا لیکن بندوق کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی وہ دشمن غائب ہو جاتا تھا۔

جہاں پارک ختم ہو جاتا تھا وہاں پہلی بار ٹکڑی کو کامیابی ہوتی نظر آئی۔ پارک کے ایک دم کونے پر زمین پر گاڑھا لال خون ایک بڑے دائرے میں سڑک پر پڑا تھا۔ اس خون کو چاروں طرف سے کسی نے اینٹوں سے گھیر دیا تھا۔ اینٹوں کا یہ گھیرا چھوٹا تھا اور تیز بارش کی وجہ سے خون کا دائرہ پھیل کر اینٹوں کے گھیرے سے باہر نکل گیا تھا۔ خون بہت گاڑھا تھا اور پوری طرح سے جم نہیں پایا تھا۔ بارش کے پانی نے اسے چاروں طرف چھترا دیا تھا، پھر بھی اینٹوں کے گھیروں میں وہ جگہ تلاش کرنا مشکل نہیں تھا جہاں کوئی گولی کھا کر گرا ہو گا، کیوں کہ درمیان میں ایک جگہ پر خون زیادہ موٹے تھکےکی صورت میں پڑا تھا اور وہاں سے بارش اسے بہا کر پتلی پتلی لکیروں کی طرح مختلف سمتوں میں لے گئی تھی۔

ٹکڑی کے سینیئر افسروں نے تھوڑی دیر تک خون کی موجودہ حالت اور بہنے والی لکیروں کی سمتوں کا معائنہ کیا۔ باقی سبھی لوگ اپنے اپنے ہتھیاروں کو کس کر پکڑے چاروں طرف بارجوں اور چھجوں پر نگاہ گڑائے رہے۔ تیز ہونے والی بارش نے چاروں طرف دھند لکے کی ایک پرت سی جما دی تھی۔ اس کے پار چھبوں پر کوئی صاف صورت دیکھ پانا نہایت مشکل تھا پھر بھی کوشش کرنے پر ہر برآمدے میں کسی کھمبے یا کھڑکی کی آڑ میں کوئی نہ کوئی پرچھائیں دکھائی پڑ ہی جاتی اور بندوق پر پھنچی ہوئی انگلیاں اور سخت ہو جاتیں۔ لیکن تھوڑی دیر لگاتار دیکھنے کے بعد پتا چلتا کہ ہر بار کی طرح ۔ اس بار بھی انہیں دھوکا ہوا ہے اور انگلیاں دھیرے دھیرے ڈھیلی ہو جاتیں۔

خون کی دھار دیکھ کر افسروں نے ایک گلی کا راستا پکڑا۔ گلی پارک کی حد سے شروع ہوتی تھی۔ راستے پر پڑی لال خون اور کیچڑ سنی لکیر دیکھنے سے ایسا لگتا تھا کہ کسی زخمی آدمی کو لوگ گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ پورے محلے کے دروازے بند تھے۔ بارش اور سناٹے نے اسے مشکل بنا دیا تھا کہ اس بات کا پتا کیسے لگایا جائے کہ زخمی کس مکان میں چھپایا گیا ہے۔ صرف زمین پر پھیلی اور پانی سے کافی حد تک ڈھلی پچھلی لکیر ہی ایک ایسا سہارا تھی جس کے ذریعے تلاش کی کچھ امید کی جا سکتی تھی۔

گلیاں عجیب مایا حال کی طرح پھیلی تھیں۔ ایک گلی ختم ہونے سے پہلے کم سے کم تین حصوں میں بٹتی تھی۔ آسمان میں چائے بادلوں اور تیز بارش نے دن دوپہر کو ڈھلتی شام سے ہم کنار کر دیا تھا۔ گلیوں میں ہلکا بلکا اُمَس بھرا اندھیرا تھا۔ اس پورے ماحول کے بیچ سے خون کی لکیر دیکھتے ہوے آگے بڑھنا اور خیالی دشمن سے اپنے کو محفوظ رکھنا دونوں کافی مشکل کام تھے۔ آگے کے دو تین افسر زمین پر نگاہیں گڑائے خون کی لکیر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے اور پیچھے کی ٹکڑی کے لوگ اپنی پستولوں اور رائفلوں کا رخ چھجوں اور بارجوں کی طرف کیے دشمن سے حفاظت کی کوشش کر رہے تھے۔ بارش کے تھپیڑے گلی کی اونچی دیواروں کی وجہ سے ایک دم سیدھے منہ پر تو نہیں لگ رہے تھے لیکن تیز موسلادھار بارش نے لوگوں کو سر سے پاؤں تک شرابور کر رکھا تھا۔

اچانک آگے چلنے والا ایک افسر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے افسر نے بھی دھیان سے کچھ سننے کی کوشش کی اور وہ بھی ٹھٹکا سا ایک جگہ کھڑا ہو کر صاف صاف سننے کی کوشش کرنے لگا۔ باقی ٹکڑی میں سے کچھ لوگوں نے ان دونوں افسروں کا کھنچا ہوا چہرہ دیکھ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور پھر دیواروں کی آڑ میں کھڑے ہو کر اندازہ لگانے لگے۔

بارش اور سناٹے سے بھیگے ہوے ماحول کی خاموشی کو توڑتی ہوئی رونے کی آوازیں ہلکے ہلکے تیرتی ہوئی اس مجمعے کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ آوازوں نے انھیں اور زیادہ ہوشیار کر دیا اور وہ لوگ آہستہ آہستہ پاؤں جما کر اسی سمت بڑھنے لگے۔ تھوڑی ہی دور بڑھنے پر آواز کچھ صاف سنائی دینے لگی۔

یہ رونے کی ایک عجیب طرح کی آواز تھی۔ لگتا تھا کہ جیسے چار پانچ عور تیں رونے کی کوشش کر رہی ہوں اور کوئی ان کا گلا دبائے ہوے ہو۔ بھنچے گلے سے رونے کا ایک الگ ہی درد ہوتا ہے ڈراونا اور اندر تک توڑ دینے والا۔ یہ رونا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جو آواز چھن کر پہنچ رہی تھی وہ پتھر دل سے پتھر دل آدمی کو بھی ہلا دینے کے لیے کافی تھی۔

آواز کا پیچھا کرتے کرتے پولیس کی ٹکڑی ایک چھوٹے سے چوک تک پہنچ گئی۔ چوک سے تین سمتوں میں گلیاں چھوٹتی تھیں۔ چاروں طرف اونچے اونچے مکانوں کے درمیان یہ چوک عام دنوں میں بچوں کے لیے چھوٹے سے کھیل کے میدان کا کام کرتاتھا اور دن میں اس وقت گلزار بنا رہتا تھا، لیکن آج وہاں بالکل سناٹا تھا۔ پولیس والوں کے وہاں پہنچتے پہنچتے آواز ایک دم غائب ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ پولیس کے وہاں تک پہنچنے کی آہٹ ماتم والے گھر تک پہنچ گئی تھی اور رونےوالی عور توں کا منہ بند کرا دیا گیا تھا۔

اس چھوٹے سے چوک کے اندر جتنے مکان تھے، پولیس والے پوزیشن لے کر ان کے باہر کھڑے ہوگئے۔ افسر بھی ایک کھمبے کی آڑ لے کر اگلے قدم کے بارے میں دبی آواز سے بحث کرنے گئے۔ اتنا یقین تھا کہ وہ مکان جس کے اندر رونا ہورہا تھا، یہیں کہیں قریب ہی تھا کیوں کہ ان کے اس چوک میں پہنچتے ہی آوازیں ایک دم بند ہو گئی تھیں۔ انھوں نے کھمبوں کی آڑ ہی سے چوک کی زمین پر خون کی لکیر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ خون کا شائبہ زمین پر ملنا یہاں پر مشکل تھا کیوں کہ اس علاقے میں پانی صرف آسمان سے نہیں برس رہا تھا بلکہ قریب قریب سبھی مکانوں کی چھتوں سے نالیاں سیدھی چوک میں کھلتی تھیں؛ چھتوں کا اکٹھا پانی نالیوں سے ہو کر چوک میں موٹی دھار کی شکل میں گر رہا تھا اور اس سے پوری زمین لبریز تھی۔

اچانک ایک سپاہی نے جوشیلے انداز میں اپنا ہاتھ بلانا شروع کر دیا۔ وہ ایک بڑے سے حویلی نما مکان کی سیڑھیوں پر دروازے سے سٹ کر کھڑا تھا۔ دروازے کے اوپر نکلا بارجہ اسے بارش سے بچا رہا تھا۔ دروازے کی چوکھٹ پر اسے لال رنگ کا دھبا نظر آ گیا۔ حالاں کہ اس دھبے پر بار ہے کی وجہ سے سیدھی بارش نہیں پڑرہی تھی، پھر بھی آڑی ترچھی پوچھاروں نے اسے کافی دھندلا دیا تھا ، اس لیے اس کی ٹھیک بغل میں کھڑے سپاہی کی بھی نگاہ اس پر دیر سے پڑی۔ اس کو ہاتھ ہلاتا دیکھ کر کچھ پولیس افسر اور داروغہ تیزی سے اپنی اپنی آڑ سے نکلے اور جھکی ہوئی پوزیشن میں تقریباً دوڑتے ہوے اس بار جے تک پہنچ گئے۔

وہاں پہنچ کر کچھ نے جھک کر چوکھٹ کا معائنہ کیا جہاں پہلی بار خون کا دھبا دکھائی دیا تھا۔اس کے علاوہ بھی کئی جگہ پر ہلکے دھند لے لال دھبے دکھائی پڑنے لگے۔ اتنا یقین ہو گیا کہ اسی گھر میں کوئی زخمی حالت میں لایا گیا ہے۔

ایک افسر نے دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا، اندر پوری طرح سناٹا تھا۔ اس نے تھوڑیتیزی سے دروازہ کھٹکھٹایا، اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ وہ پیچھے ہٹ گیا اور اس نے ایک داروغہ کو اشارہ کیا۔ داروغہ نے آگے بڑھ کر دروازہ تقریباً پیٹنا شروع کر دیا۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے دروازے کو تین چار لاتیں لگائیں ۔ لات لگنے سے دروازہ بری طرح ہل گیا۔ پرانا دروازہ تھا، ٹوٹنے کی حالت میں آ گیا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ اندر سے کچھ آواز سی آئی۔ لگا کوئی دروازے کی طرف آ رہا ہے۔

سیڑھیوں پر کھڑے لوگ دونوں طرف کنارے سمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ دو ایک نے اپنے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیے۔

دروازے کے پاس پہنچ کر قدموں کی آہٹ تھم گئی۔ صاف تھا کہ کوئی دروازے کے پیچھے کھڑا ہو کر دروازہ کھولنے نہ کھولنے کے پس و پیش میں تھا۔ پھر اندر سے چٹخنی کرنے کی آواز آئی اور ایک ماتمی خاموشی کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔

سامنے ایک مر جھایا ہوا سپاٹ بوڑھا چہرہ تھا جسے دیکھ کر یہ اندازہ کر پانا بہت مشکل تھا کہ مکان میں کیا کچھ رونما ہو چکا ہو گا۔ سب کے سب بہرے ہو گئے تھے کیا ؟ ہم لوگ اتنی دیر سے برسات میں کھڑے بھیگ رہے ہیں اور دروازہ پیٹ رہے ہیں۔“ بولنے والے کے لفظوں کی جھنجلاہٹ نے بوڑھے کو پوری طرح بے چین کر دیا۔ اس کی خاموشی غیر معمولی تھی۔ دروازہ کھلنے سے کچھ بوچھار میں اس کی پیشانی اور چہرے پر پڑیں اور اس کی سفید داڑھی میں آ کر الجھ گئیں۔

اندر کوئی زخمی چھپا ہے کیا ؟ "

" جی نہیں۔۔۔ کوئی نہیں ہے۔ اس کی آواز اتنی ٹھری ہوتی کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، کسی نے اسے ڈپٹنے کی کوشش نہیں کی۔

" بڑے میاں ، ہم زخمی کے بھلے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ تم اسے ہمارے حوالے کر دو۔ ہم اسے اسپتال تک اپنی گاڑی میں پہنچا دیں گے۔ دوادارو وقت سے ہو گیا تو بیچ سکتا ہے۔ نہیں تو اب پتا نہیں کتنے دنوں تک کرفیو لگا رہے اور ہو سکتا ہے علاج نہ ہونے سے حالت اور خراب ہوجائے۔“

آپ مالک ہیں حضور ، پورا گھر کھلا ہے، دیکھ سکتے ہیں۔ اندر کوئی نہیں ہے۔"

اس نے گھر کی طرف اشارہ کیا لیکن خود دروازے پر سے نہیں ہٹا۔ وہ پورا دروازہ گھیرے کھڑا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بوڑھے چہرے کی غیر جذباتیت نے بوندا باندی کے ساتھ مل کر پورے ماحول کو اس قدر پر اسرار بنا دیا تھا کہ سب کچھ ایک طلسم سالگ رہا تھا۔

سب کو شش و پنج میں دیکھ کر بوڑھے نے دھیرے دھیرے دروازہ بند کرنا شروع کر دیا۔ اس کے حرکت میں آتے ہی یہ طلسم اچانک ٹوٹ گیا اور ایک افسر نے جھپٹ کر اپنا بینت دونوں دروازوں کے بیچ پھنسا دیا اور بوڑھا لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

دروازے کے فوراً بعد ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کمرے کے بعد آنگن تھا جس کے چاروں طرف برآمدہ تھا۔ برآمدے سے لگے ہوے چاروں طرف پانچ چھ کمرے تھے جن کے دروازے آنگن کی طرف کھلتے تھے۔ برآمدے میں سات آٹھ عور توں ، دو تین جوان مردوں اور تین چار بچوں کا ایک ماتمی دستہ تھا جو ایک چارپائی کو گھیرے کھڑا تھا۔ زخمی ننگی چار پائی پر پڑا تھا۔ خون چار پائی کی رسیوں کو بھگوتا ہوا زمین پر پھیل گیا تھا۔ حالاں کہ خون سے چار پائی پر لیٹے آدمی کا پورا جسم نہایا سا تھا، پھر بھی غور سے دیکھنے پر صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کے بائیں کندھے سے قریب ایک بتا نیچے سینے پر چپکا ہوا قمیص کا حصہ زیادہ سرخ اور گاڑھے خون سے سنا تھا۔ گولی وہیں لگی تھی۔ اپنی تجربہ کار آنکھیں چار پائی پر لیٹی صورت پر دوڑانے کے بعد ایک داروغہ نے اپنی بغل میں کھڑے افسر کے کان میں پھسپھساتے ہوے کہا:

"مر گیا ہے حضور ۔"

افسر نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ کسی نے سنا نہیں تھا۔ چار پائی کے ارد گرد کھڑی عورتیں اور مرد ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ چار پائی پر لیٹا آدمی صرف زخمی پڑا ہے، مرا نہیں ہے۔ خاص طور سے عورتیں یہی سوچ رہی تھیں، یا ہو سکتا ہے ان میں سے کچھ لوگوں کو احساس ہو چکا ہو کہ زخمی مر گیا ہے، پر وہ اس بات کو ماننا نہ چاہتے ہوں۔

عور توں نے پھر سے رونا شروع کر دیا۔ زیادہ تر عورتیں پردہ کرنے کے لیے اپنے ماتھے پر کپڑا ڈالے ہوے تھیں۔ وہ بھنچی آواز میں دھیرے دھیرے بے نقط رو رہی تھیں۔ ان کے جسم ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ ان کے رونے اور بدن کی تھر تھراہٹ میں ایک عجیب سی لے تھی اور یہ کے تبھی ٹوٹتی تھی، جب ان میں سے کوئی ایک اچانک دوسری سے تیز آواز میں رونے لگتی یا کسی کا جسم دوسری عورتوں سے تیز کانپنے لگتا۔

افسروں نے آپس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کی اور ان میں سے ایک نے اپنے ماتحت کو حکم دیا:

"زخمی کو چار پائی سمیت اٹھا لو۔ کالونی میں کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور مل جائے گا۔"

پولیس کے چار پانچ لوگوں نے پھرتی سے چار پائی چاروں طرف سے پکڑ کر ہاتھوں پر اٹھالی۔

چار پانی کے چاروں طرف اب بھی عورتیں اور مرد کھڑے چپ چاپ دیکھ رہے تھے۔ صرف عورتوں کے رونے میں رکاوٹ پڑی۔

" آپ لوگ بھی مدد کیجیے۔ جتنی جلدی اسپتال پہنچیں گے، اتنا ہی اچھا ہو گا۔"

ارد گرد کھڑی عورتوں اور مردوں میں کچھ ہلچل ہوئی۔ دو تین مردوں نے چار پائی کو ہاتھ لگا یا۔

چار پائی تھامے لوگ دھیرے دھیرے دالان سے باہری دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

ایک عورت کو اچانک کچھ یاد آیا۔ وہ دوڑ کر ایک موٹی چادر لے آئی اور اس نے لیٹے ہوے آدمی کو چادر اڑھا دی۔ باہر بارش تیز تھی۔ شروع میں جس بوڑھے نے دروازہ کھولا تھا اس نے بر آمدے میں ایک کھونٹی پر ٹنگا چھاتا اتار لیا اور چار پائی پر لیٹے آدمی کے منہ پر آدھا چھاتا کھولا اور پھر بند کر دیا۔ وہ مطمئن ہو گیا کہ باہر بارش میں یہ چھا تا کام کرے گا۔

چار پائی کو لوگ اس طرح اٹھائے ہوے تھے کہ وہ ان کی کمر تک ہی اٹھی تھی۔ دروازے پر آ کر لوگ رک گئے۔ چار پائی جوں کی توں دروازے سے نہیں نکل سکتی تھی۔ باہر نکالنے کے لیے اسے ٹیڑھا کرنا ضروری تھا۔ پائنتی کی طرف کے لوگوں نے دہلیز سے باہر نکل کر چار پائی پکڑی۔ چوڑائی میں بھی ایک طرف سے لوگ ہٹ گئے۔ صرف تین طرف کے لوگوں نے ایک طرف چار پائی ٹیڑھی کر کے اسے باہر نکالنا شروع کر دیا۔ چار پائی بار بار پھنسی جارہی تھی۔ بہت صبر اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ چار پائی دھیرے دھیرے آدھی سے زیادہ جھک گئی اور اس پر لیٹا شخص ڈھلان کی طرف لڑھکنے سا لگا۔ دو تین لوگوں نے جھپٹ کر اسے سنبھالا۔ پوری حرکت کو پیچھے سے منظم کرنے والے افسر نے جھنجھلا کر تیزی دکھانے والے کو ڈانٹا :

"سنبھال کے نکالو ۔ ابھی لاش گرجاتی"

"لاش" کے لفظ نے ماحول کو پوری طرح متھ ڈالا۔ عوررتیں سم کر ٹھٹک گئیں ۔ بوڑھے نے ایک لمبی سسکاری لی اور اپنے ہاتھ کے چھاتے پر پورا بوجھ ڈال کر کھڑا ہوگیا۔ اچاک وہ اتنا بوڑھا ہوگیا کہ اسے چھاتے کا سہارا لینے کی ضرورت پڑنے لگی۔

عورتوں نے پہلے بامٹی کا ماتم شروع کیا۔ ان کی دبی آوازیں پوری بلندی سے اٹنے گرنےلگی۔ کچ نے اپنی چھاتی زور زورر سے پیٹنا شرووع کردیا ۔ بھلاوے کا ایک جھینسا پردہ جسے انھوں نے اپنے چاروں طرف بن رکھا تھا ،ایک دم سے تار تارہوگیا۔جس وقت زخمی وہاں لایا گیا ہوگا اُس وقت ضرور اس کے جسم میں حرکت رہی ہوگی ۔ دھیرے دھیرے جسم مردہ ہوگیا ہوگا ۔ پروہ اسے ماننے کو تیار نہیں تھیں ۔پہلی با "لاش"کے لفظ نے ان کو اس حقیقت سے واقف کرایا تھا۔

ان عورتوں میں سے دوتین جھپٹیں اور بانہیں پھیلائے مُردے کے اوپر گرپڑیں۔ تب تک چارپائی باہر نکل گئی تھی ۔اس کا آدھا حصہ بارجے کے نیچے تھا اور آدھا بارش کے نیچے ۔جو لوگ پاؤں پر گرنے کے کارن چارپائی پر گرپڑی۔ باقی عورتیں کے پچھاڑ کھاکر چارپائی پر گرنے کے کارن چارپائی زمین پر گڑپڑی۔ باقی عورتیں بھی چارپائی کے چاروں طرف بیٹھ گئیں اوپر بارش تھی ،نیچے عورتوں کا ماتمی دستہ اور ان سب سے شرابور ہوتی ہوئی بیچارے مردوں کی خاموشی اور اُداس بھیڑ تھی۔

مردوں میں سے کچھ لوگ آگے بڑھے انھوں نے عورتوں کو آہستہ آہستہ چارپائی سے الگ کرنا شروع کیا۔ کچھ عورتیں ہٹائے جانے پر چھٹک چھٹک کر پھر سے لاش پرجا پڑتیں۔ مردوں نے ہلکی سختی سے انہیں ڈھکیل کر الگ کیا۔

پولیس والوں اور گھر کے مردوں میں سے کچھ نے پھر سے چارپائی اٹھالی۔اس بارا انہوں نے چارپائی اپنے کندھوں پر لادلی ۔تیز رفتار سے وہ گلی کے باہر بھاگے۔ مشکل سے دس قدم پر گلی بائیں طرف مڑتی تھی۔ پہلے چارپائی عورتوں کی نظر سے اوجھل ہوئی، پھر اس کے پیچھے چلنے والا قافلہ بھی دھیرے دھیرے غائب ہوگیا۔صرف ماتم کرنے والی عورتوں کی آوازیں ان کا پیچھا کرتی رہیں ۔دھیرے دھیرے وہ آوازوں کی حد کے باہر چلے گئے۔ اگر بیچ میں اونچے اونچے مکانوں کی دیواریں نہ ہوتیں اور وہ دیکھ سکتے ہوتے تو دیکھتے کہ عورتیں گھر کے اندر چلی گئی ہیں اور ایک بوڑھا آدمی بارش کی ہلکی بوچھاروں میں چھاتے کی ٹیک لگائے دروازے کے بیچ کھڑا ہے۔ اسے دروازہ بند کرنا تھا، لیکن وہ پتا نہیں بھول گیا تھا یا شاید اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اب دروازہ بند کرنے کا کوئی حاصل نہیں رہ گیا ہے اس لیے وہ چپ چاپ بے چین خاموشی کے ساتھ کھڑا تھا۔

۲

کرفیو لگنے کے ساتھ ہی یکبار گی بہت ساری چیزیں اپنے آپ ہی ہو گئیں ۔ مثلاً شہر کا ایک حصہ پاکستان بن گیا اور اس کے رہنے والے پاکستانی۔ یہ حصہ جانسن گنج سے اٹالہ اور خلد آباد سے مٹھی گنج کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ ہر سال دو ایک بار ایسی نوبت ضرور آتی تھی جب شہر کے باقی حصوں کے لوگ اس حصے کے لوگوں کو پاکستانی قرار دیتے تھے۔ پچھلے کئی سالوں سے جب بھی شہر میں کرفیو لگتا تو اس کا مطلب صرف اس علاقے میں کرفیو سے ہوتا۔ اس کے پرے جو شہر تھاوہ ان حادثوں سے بالکل بے خبر اپنے میں مست ڈوبا رہتا۔ جنکشن سے سول لائنز کی طرف اتر نے والوں کو یہ احساس بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ چوک کی طرف کتنا خوفناک سناٹا پھیلا ہوا ہے۔ کٹرا، کیٹر گنج یا سول لائنز کے بازاروں میں زندگی اپنی چہل پہل سے بھر پور رہتی اور چوک، مٹھی گنج میں لوگ دن کے اُن چند گھنٹوں کا انتظار کرتے جب کرفیو میں چُھوٹ ہوتی اور وہ بھیڑوں کی طرح بھڑ بھڑ اکر سڑکوں پر نکل کر دوزخ سے نجات محسوس کرتے۔

اس بار بھی یہی ہوا۔ شہر کے پاکستانی حصے میں کرفیو لگ گیا۔ کچھ سڑکیں ایسی تھیں جو ہندو اور مسلم آبادی کے بیچ سے ہو کر گزرتی تھیں۔ ان کے مسلم آبادی والے حصے میں کرفیو لگ گیا اور وہاں زندگی پوری طرح سے تھم گئی، جب کہ ہندو آبادی والے حصوں میں زندگی کی رفتار کچھ دھیمی پڑگئی۔

سعیدہ کے لیے یہ پہلا کرفیو تھا۔ پچھلے جون میں جب کرفیو لگا تھا تو وہ گاؤں گئی ہوئی تھی۔ جس وقت کرفیو لگا وہ چوک میں گھنٹا گھر کے پاس ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر کی دکان میں اپنی دوسری لڑکی کو دوا دلا نے لے گئی تھی۔ اس کی بڑی لڑکی گھر پر اپنی دادی کے پاس رہ گئی تھی۔ سعیدہ پہلے ہی دن سے اپنی ساس کی منت کر رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر کی دکان تک چلی چلے ، لیکن ایک تو بیٹری کا دھندا ایسا تھا کہ اس میں دو تین گھنٹے کی بربادی سے دوسرے جون کی روٹی خطرے میں پڑجاتی تھی اور شاید اس لیے بھی کہ اس کے تابڑ توڑ دو دو لڑکیاں ہو گئی تھیں اور اس کی ساس کو اس کی لڑکیوں سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ وہ آج تک ٹال مٹول کرتی رہی۔ اس کی صلاح پر سعیدہ لڑکی کو گھر یلو دوائیں دیتی رہی لیکن آج جب سویرے سے پوری طرح پست دکھائی دینے لگی تب اس نے اپنی پڑوسن سیف النسا کو بمشکل تمام اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ گھنٹا گھر تک چلے۔ بدلے میں اس نے سیف النسا کے ساتھ چوڑی کی دکان تک چلنے کا وعدہ گیا جہاں سے سیف النسا چوڑیاں خریدنے کے لیے کافی دنوں سے سوچ رہی تھی۔

دوا لے کر وہ ابھی دکان کے باہر نکلی ہی تھیں کہ کرفیو لگ گیا۔ دراصل کرفیو لگنے کی کوئی رسمی کارروائی نہیں ہوئی لیکن سیف النسا کے تجر بے اسے نے بتا دیا کہ کرفیو لگ گیا ہے۔ پورے چوک میں عجیب افراتفری تھی۔ دوکانوں کے شٹر اتنی تیزی سے گر رہے تھے کہ ان کی ملی جلی آواز پورے ماحول میں خوف کا زبردست احساس طاری کر رہی تھی۔ جس طرح بچے ایک قطار میں اینٹیں کھڑی کر کے انہیں ایک سرے سے ڈھکیلتے ہیں تو ہروں کی طرح اینٹیں ایک کے اوپر ایک گرتی چلی جاتی ہیں ، اسی طرح بھیڑ کے ریلے نخاس کی طرف سے گھنٹا گھر کی طرف چلے آرہے تھے۔

یا خدا... رحم کر! " سیف النسا کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس نے جھپٹ کر سعیدہ کی کلائی تھام لی۔ جب تک اچانک منہ کھولے سعیدہ کچھ سمجھتی تب تک وہ اسے گھسیٹتی ہوئی بازار میں قریب پچیس تیس گز آگے بڑھ گئی۔

کا ہوا بھی ؟

کر فو... کرفو... یاخدا، کسی طرح گھر پہنچ جائیں۔

ایک ایک قدم آگے بڑھنا مشکل تھا۔ مخالف سمت سے لہروں کی طرح جم غفیر پھٹا پڑ رہا تھا۔ دکان دار بدحواس سے اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ سائیکلیں، رکشے، گاڑیاں اور اکے ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھنے کے چکر میں اس قدر ریل پیل مچائے ہوے تھے کہ عام دنوں کے لیے مناسب چوڑی سڑک بھی کسی پتلی گلی کی طرح ہو گئی تھی۔

سيف النسا سعیدہ کو گھٹتے ہوے کسی طرح پھل منڈی تک پہنچ پائی۔ پھل منڈی کےدہانے پر روز ریلا لگانے والے ٹھیلے غائب تھے۔ ٹھیلے والے بڑی جلدی میں گلیوں یا گھنٹا گھر کی طرف بھاگے تھے۔ یہ پہلی ہی نظر میں عیاں ہو جاتا تھا کیوں کہ چاروں طرف آم، سیب اور سنترے بکھرے پڑے تھے جنھیں بدحواس لوگ کچلتے ہوے بھاگ رہے تھے۔ سیف النسا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ سعیدہ کو لے کر پھل منڈی ہی میں گھس گئی اور اسے پار کرتی ہوئی میسر گنج کی بھول بھلیوں میں بھٹک گئی۔

میسر گنج کا جسم کا بیوپار پوری طرح ٹھنڈا پڑا تھا۔ رنڈیوں نے اپنے دروازے بند کر لیے تھے اور روز ٹھنڈ کے جھنڈ مٹر گشت کرنے والے گاہکوں کا کہیں پتا نہ تھا۔ دو دو چار چار گھروں کے بعد اوپری منزل کی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی کوئی رنڈی ، ایک عام منظر تھا۔ ان رنڈیوں کی آنکھوں میں بے چارگی اور غصہ صاف دکھائی پڑتا تھا کیوں کہ انھیں پچھلے کئی دنگوں کا تجربہ تھا۔ ہر بار کرفیو لگنے پر دھیرے دھیرے وہ فاقے کے قریب پہنچ جاتی تھیں اور زیادہ تر کوٹھوں پر تو چار چھ دن بعد ہی سے خالی پانی پینے کی نوبت آ جاتی تھی۔

سیف النسا یہاں کے ماحول سے پہلے سے واقف تھی۔ دو بار وہ اپنے شوہر کے ساتھ خریداری کرنے کے لیے ان گلیوں کے پاس کی دکانوں پر گئی تھی، اور باہر سے جھانک کر جتنی دور دیکھا جا سکتا تھا اتنی دور تک گلی کا جائزہ اس نے لیا تھا۔ سعیدہ کے لیے آج پہلا موقع تھا جب وہ ان گلیوں کو دیکھ رہی تھی، اس لیے اسے گنہگاری، سنسنی اور شرم کی ملی جلی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ سیف النسا کے بنا بتائے بھی وہ جان گئی تھی کہ وہ کہاں آ گئی ہے۔ سیف النسا اس کی کلائی پکڑے کھینچتی چلی جارہی تھی۔ سناٹے اور خوف کی وجہ سے گلیاں اسے عجیب طرح کے اسرار سے بھری لگ رہی تھیں۔ انھیں کی طرح گھبرائے ہوے اکادکا لوگ پاس سے گزرتے ہوے اس رنگ کو زیادہ گھرا بناتے جا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ان گلیوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوے وہ گڑمنڈی کے پاس واپس جی ٹی روڈ پر نکلیں۔

اس وقت تک جی ٹی روڈ کافی حد تک خالی ہو گئی تھی۔ پولیس کی ایک جیپ بڑی تیزی سے ان کے پاس سے گزری۔ اس میں بیٹھا ہوا ایک افسر ہیجان زدہ آواز میں کرفیو لگائے جانے کا اعلان کر رہا تھا اور لوگوں سے فوراً اپنے اپنے گھروں میں لوٹ جانے کی اپیل کر رہا تھا۔

کرفیو کا اعلان سعیدہ کے لیے ایک خوفناک تجربہ تھا۔ اپنی بچی کو چھاتی سے چپکائے ہوے وہ پوری طرح سیف النسا کی مرضی پر کھنچی چلی جارہی تھی۔ سیف النساز یادہ تجربہ کار اور بہادر تھی ، اس لیے اپنے کو اس کے اوپر چھوڑ کر وہ خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ در اصل سعیدہ کو اس شہر میں آ کر رہے ہوے صرف چار سال ہوے تھے اور ابھی تک اس شہر میں وہ خود کو بالکل اجنبی محسوس کرتی تھی۔ اس کا گھر پورہ مفتی کے پاس تھا اور شادی کے چار سال بعد بھی اس کا من وہیں کے لیے بھڑکتا تھا۔ اس کا شوہر اپنے پورے خاندان کے ساتھ بیٹری بناتا تھا اور شادی کے بعد شروع کے کچھ مہینوں کو چھوڑ کر جب وہ اس کے ساتھ سنیما، بازار وغیرہ جایا کرتا تھا، اسے اکثر سودا سلف لینے لانے کے لیے ساتھی کی ضرورت پڑتی تھی اور ایسے وقت سیف النسا ہی اس کے کام آتی تھی۔ سیف النسا کا شوہر جیپ فیکٹری میں چپراسی تھا اس لیے اسے ہر مہینے بندھی بندھائی رقم ملتی تھی۔ وہ بیٹری بنانے کا کام کرتی ضرور تھی لیکن شوقیہ ۔ صرف فاضل آمدنی کے لیے۔ سعیدہ کی حالت دوسری تھی؛ بیڑی اس کے خاندان کا واحد ذریعہ معاش تھا۔ اس کا پورا خاندان اوسطاً چودہ گھنٹے روز محنت کرتا تھا تب کہیں جا کر دو جون کی روٹی کا انتظام ہو پاتا تھا۔ شادی کے دو چار ہی مہینوں میں اس نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ اس کے اور اس کے شوہر کے لیے سنیما دیکھنے یا بازار گھومنے سے زیادہ ضروری ہے کہ گھر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اندھیری سیلن بھری تنگ کو ٹھری میں کمر جھکائے جھکائے بیٹری کے بنڈل باندھتے رہیں اور بچوں کا کم سے کم پیٹ بھرنے کا سکون لیے، رات میں سو سکیں۔

حالاں کہ شہر کی ٹیڑھی میڑھی نامعلوم گلیوں میں سیف النسا کا ہاتھ تھامے تھامے گزرتے ہوے سعیدہ کو لگ رہا تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہیں ہو گا، لیکن آخر میں اسے اپنی گلی مل ہی گئی۔ اس کی گلی بھی ویران تھی، پھر بھی اس گلی میں پہنچتے ہی اسے ایک قسم کا سکون محسوس ہونے لگا۔

گلی کے مکان بری طرح بند تھے۔ دروازے کھڑکیاں سبھی پوری طرح بھڑے ہوے تھے۔ اتنا خوفناک سناٹا اور اتنی خاموشی سعیدہ نے آج تک اپنی گلی میں محسوس نہیں کی تھی۔ اسے لگا کہ ویران گلی میں وہ اپنا گھر بھول جائے گی۔ ان کے گلی میں پہنچنے کے بعد دو ایک کھڑکیاں ہلکے سے کھڑ کیں۔ ایسا لگا جیسے کسی نے جھانک کر ایک دم سے کھڑکی کے پلے بند کر دیے۔ کھڑکیوں کے ۔ اس طرح کھلنے بند ہونے سے سعیدہ کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سیف النسا کا گھر پہلے پڑتا تھا اس سے کچھ اور آگے سعیدہ کا گھر تھا۔

سیف النسا کے ہاتھ چھڑا کر اپنے گھر میں گھسنے کے بعد اس کے اور اپنے گھر کے بیچ کے تیس چالیس گھر کے فاصلے کو پار کرنے میں سعیدہ کو کئی یک لگ گئے۔ اپنی بیٹی کو سینے سے چپکائے جب وہ اپنے گھر کے سامنے والی نالی کو پھاندتے ہوے دروازے پر پہنچی تو خوف اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس نے ہلکے سے دروازے پر دستک دینی چاہی لیکن دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی اس نے پایا کہ وہ بری طرح سے دروازہ پیٹ رہی ہے۔

سب سے پہلے اندر سے اس کی ساس کے کھانسنے کی آواز آئی، پھر کوئی مردانے قدموں کی آہٹ آکر دروازے پر ٹھٹک گئی۔ آہٹ سے اس نے پہچانا، یہ اس کا شوہر تھا۔ اچانک اس کے جی میں آیا کہ وہ رونے لگے۔ گھر کے پاس پہنچتے ہی کوئی غیر مرئی احساس تھا جو اسے رونے پر مجبور کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس کے شوہر نے دروازہ کھولا وہ سچ مچ رونے لگی ۔ پہلے دھیرے دھیرے، پھر ہڑک ہڑک کر۔

سعیدہ کی ساس نے آگے بڑھ کر اس کی بیٹی کو گود میں لے لیا۔ بیٹی صبح سے زیادہ پست نظر آرہی تھی۔ اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیر تے پھیر نے ساس بھی رونے لگی۔ پہلی بار سعیدہ کو اپنی ساس سے ممتا محسوس ہوئی اور وہ زور زور سے رونے لگی۔

کچھ نہیں ہوا... سب ٹھیک ہو جائے گا... اللہ سب ٹھیک کرے گا... " ساس کے کہنے پر سعیدہ کو لگا کہ سچ مچ کچھ نہیں ہوا اور سچ مچ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے بھی کیا ہوا تھا اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ تو بھاگ دوڑ اور سناٹے کے خوف سے گزرتی ہوئی یہاں تک آ گئی تھی۔ راستے میں سیف النسا کے منھ سے اسے صرف اتنا پتا چلا کہ کرفیو نام کی کوئی چیز لگ گئی ہے جس میں گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت ہے۔ اگلے کچھ دنوں میں یہ بات اسے زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آ سکی کہ گھر سے باہر نہ نکلنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

۳

کرفیو شروع میں تو ہر جگہ لگا لیکن جلد ہی ان حصوں سے اس کا اثر کم ہونے لگا جو پاکستانی نہیں تھے۔ ان حصوں میں ہندو رہتے تھے اور ہندہونے کے ناتے ظاہر تھا کہ اس دیش سے سچا پریم کرنے والے وہی تھے ۔ اس لیے شروع میں تو لوگ ضرور کچھ گھنٹوں کے لیے اندر قید ہوے لیکن جلد ہی وہ گھر کے دروازے اور کھڑکیاں کھول کر جھانکنے لگے۔ بچوں نے ماں باپ کی آنکھیں بچائیں اور چبوتروں پر آکر بیٹھ گئے۔ بیچ بیچ میں ماں باپ کان پکڑ کر چینختے چلاتے بچوں کو گھر کے اندر پٹک دیتے لیکن بچے پھر چُھوٹ کر اندر سے باہر بھاآتے۔

بیچ بیچ میں دو دو چار چارکی تعداد میں پولیس والے آتے اور بچوں کو ہُڑکاتے ہوے چبوتروں پر ڈنڈے پٹکتے چلے جاتے۔ بچوں کی ہمت اتنی بڑھ گئی کہ وہ گلیوں میں گلی ڈنڈے سے لے کر کرکٹ تک تمام کھیل کھیلنے لگے۔ کچھ عورتیں بھی باہر دروازوں پر نکل کر بتیانے لگیں۔ ان کی چِنتا کا خاص موضوع یہ تھا کہ بچے کھیلتے ہوے گلی سے باہر سڑکوں پر نہ چلے جائیں اور دفتروں ، دکانوں یا کارخانوں میں کئے ان کے مرد صحیح سلامت گھر لوٹ آئیں۔ زیادہ تر گھر خاندان کے کمانے والے ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ کچھ بچے بھی اسکولوں میں پھنس گئے تھے۔

جیسے جیسے دیر ہوئی جا رہی تھی، عورتوں کی گھبراہٹ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ گلی کافی گھنے مکانوں کی بستی تھی لیکن بستی کے بیچ میں ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا خالی پڑا تھا۔ اسے کسی نے برسوں پہلے خرید لیا تھا لیکن ابھی تک اس پر کوئی تعمیر نہیں کی گئی تھی۔ برسوں سے یہ محلے کا کوڑاخانہ بنا ہوا تھا اور برسوں سے محلے کی عورتیں مشتر کہ مصیبت یا خوشی کے موقعوں پر وہاں جمع ہو کر شور شرا با کرتی چلی آرہی تھیں۔ دھیرے دھیرے گئی عورتیں وہاں اکٹھی ہو گئیں۔ جن کے یا مرد اور بچے واپس آ گئے تھے انھوں نے اپنے سبھی لوگوں کو گھروں کے اندر کر لیا اور کھڑکیوں چھجوں سے ساری کارروائی دیکھنے لگیں، اور جن کے گھر کا کوئی فرد باہر رہ گیا تھا انھوں نے باہر کھلی جگہ پر اپنے کو اکٹھا کر لیا اور باتیں کرنے لگیں۔ ان کی آوازوں میں جوش اور دکھ بھرا ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے اندھیرا گلی میں پھیلنے لگا تھا اور باہر لگتا تھا کہ کرفیو پوری سختی کے ساتھ لگ گیا ہے، اس لیے باہر سے گلی میں آنا جانا بہت کم ہو گیا۔ اکا دکا مردوں کے علاوہ چار پانچ بچے ہی اندر آ پائے تھے۔ ان مردوں اور بچوں کے ساتھ کچھ عورتیں گھروں کے اندر چلی گئیں۔ آنے والے اپنے ساتھ افواہوں کا پلندا لے کر آئے تھے۔ ان کے پاس طرح طرح کی خبریں تھیں ۔

مثلاً دسیوں ہندوں کی لاشیں نالیوں میں پڑی ہیں، یا پولیس نے لاشین ٹرکوں میں لاد کر جمنا

نہیں تھے۔ ان حصوں میں ہندو رہتے تھے، اور ہندو ہونے کے ناتے ظاہر تھا کہ اس دیش سے سچا پریم کرنے والے وہی تھے۔ اس لیے شروع میں تو لوگ ضرور کچھ گھنٹوں کے لیے اندر قید ہوے لیکن جلد ہی وہ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں کھول

مثلا دسیوں ہندوؤں کی لاشیں نالیوں میں پڑی ہیں، یا پولیس نے لاشیں کئی ٹرکوں میں لاد کر جمنا یہ گلی بھی قریب قریب پڑوس کی گلی ہی کی طرح تھی جس میں مسلمان رہتے تھے ۔ اسی کی طرح گندی ، مفلس اور بد بودار ۔ گھروں کے پاخانوں کی گندگی بہہ بہہ کر گلی کی نالیوں میں پہنچ رہی تھی اور ، اگر چہ گلی کے روز مرہ کے باشندوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، پھر بھی باہر سے پہلی بار گلی میں آنے پر یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی بنا ناک پر رومال رکھے گلی میں داخل ہو جائے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ ہندوؤں کی گلی تھی، اس لیے کرفیو نے لوگوں کو گھروں کے اندر بند نہیں کیا تھا۔ ان کے صرف گلی کے باہر نکلنے پر پابندی لگی تھی۔

گلی میں دیوی لالہ کا داخلہ ایک تفریحی رایٹ کی طرح تھا۔

دیوی لالہ روز کی طرح صبح گلی سے نکل گئے تھے اور روز ہی کی طرح گرتے پڑتے گلی میں لوٹ رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ روز نو دس بجے رات کے بعد لوٹتے تھے اور آج دو تین گھنٹے پہلے لوٹ رہے تھے۔ روز گلی کے زیادہ تر لوگ جس وقت کھانا کھا رہے ہوتے ہیں ، اسی وقت دیوی لالہ کی شراب میں ڈوبی ہوئی کڑک دار آواز ہوا میں تیرتی ہے۔ آج دیوی لالہ کچھ پہلے آ گئے تھے۔ روز کی طرح نہ تو وہ چہک رہے تھے اور نہ ہی شراب پینے سے پیدا ہونے والی خوداعتمادی ان کے اندر تھی۔ وہ کچھ پریشان سے تھے۔ ایک تو انھیں شراب نہیں ملی تھی اور دوسرے ان کو راستے میں کئی جگہ گرتے پڑتے آنا پڑا تھا۔ اس سے ان کے جسم پر جگہ جگہ کھرونچیں آ گئی تھیں اور ان کے پاجامے کے پائنچے نالیوں کے پانی اور گندگی سے شرابور تھے۔

دیوی لالہ پیشہ ور خون بیچنے والوں میں سے تھے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن سروپ رافی اسپتال میں جا کر اپنا خون بیچتے تھے اور چالیس پچاس روپے لے کر لوٹ آتے تھے۔ اسی آمدنی کے بل پر وہ شام کو ٹھرا چڑھا کر لوٹتے تھے۔ آج انھوں نے خون ضرور بیچا پر پی نہیں پائے ؛ اس سے پہلے ہی کرفیو لگ گیا۔ وہ تب تک کرفیو والے علاقے میں داخل ہو گئے تھے۔ اگر کہیں انھیں پہلے پتا چل جاتا تو وہ شراب پی کر ہی کرفیو میں گھستے۔ ایک بار گھس جانے کے بعد انھوں نے باہر نکلنے کی کوشش بھی کی، لیکن شٹروں کے گرنے، لوگوں کے بدحواس بھاگنے دوڑنے اور پولیس کی لاٹھیوں نے ایک عجیب سا چکر د یو بنا دیا تھا۔ اس چکر دیو میں وہ صرف آگے کو بھاگ رہے تھے اور کافی دیر بعد جب انھیں سنبھلنے کا ہوش آیا تو وہ اپنے گھر کی گلی کے دہانے پر تھے۔

دیوی دو دیوی لال کو دیکھتے ہی گلی کے کچھ بچے اکٹھے ہو گئے اور روز کا کورس شروع ہو گیا۔

دیوی کے دو ٹوپی

بکری کے دو کان

دیوی لالہ بگنے پہنچے

ان کو پکڑ لیا شیطان

عور توں نے اس پریشانی کے ماحول میں بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ دو ایک نے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرانا چاہا۔ پتا نہیں یہ ماحول میں چھائی دہشت اور اداسی کا اثر تھا یا دیوی لالہ کی بے کیفی کا کہ آج بچے چپ ہو گئے۔ روز کی طرح انھوں نے روکنے پر اور زیادہ اچھل اچھل کر دیوی لالہ کی مٹی پلید نہیں کی۔ شراب نہ پینے کی وجہ سے دیوی لالہ کو اپنا بدن ٹوٹتا سا محسوس ہو رہا تھا اور انھیں بولنے میں دقت ہورہی تھی۔

کیوں لالہ دنگلے میں بہت لوگ مرے کا ؟ "

سوال دیوی لالہ سے پوچھا گیا تھا۔ وہ اکیلے آدمی تھے جو کرفیو لگنے کے بعد کافی دیر تک کر فیوز دہ علاقے میں گھومنے کے بعد محلے میں پہنچے تھے، اس لیے منفرد ہونے کے احساس میں گم تھے۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں سکیڑیں اور پورے یقین سے بولنے کی کوشش کی۔ اگر چہ شراب نہ پینے سے ان کی زبان لڑکھڑارہی تھی ، پھر بھی انھوں نے سنبھلنے کی پوری کوشش کی۔

ارے چاچی، شہر میں لاش ہی لاش ہیں۔ دوئی ٹرک میں لاش جاتی تو ہم خود دیکھا... پولیس والے جمنا میں بہانے لے جا رہے تھے ۔ مُسلے مار چھرا چا کو چمکاتے گھوم رہے ہیں۔ ہندون بیچاروں کا تو کوئی رکھوالا نہیں ہے۔"

ہے بھگوان ، جو لوگ ابھی گھر نہیں لوٹے ان کا کیا ہو گا ؟ "

جن عورتوں کے شوہر اور بچے گھروں کو نہیں لوٹے تھے ان کے چہرے اتر گئے اور کچھ نے تو ہولے ہولے رونا سکنا شروع کر دیا۔ جن کے گھر کے لوگ صحیح سلامت لوٹ آئے تھے انھوں نے چٹخارے لینے شروع کر دیے۔

تولالہ، کیا مسلمان پولیس کے رہتے چاقو چھرا لیے گھوم رہے ہیں ؟

" گھوم رہے ہیں ؟ ارے گھونپ رہے ہیں! کئی تو ہم اپنی سامنے مارتے دیکھے۔ ہندو بیچارے پٹ پٹ گر رہے ہیں۔ اب ان مسلوں کو جان لینے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ پولیس ان کا کیا بگاڑ لے گی۔ کتنی لہاشیں تو ہمارے پیر کے نیچے آتے آتے بچیں۔"

دیوی لالہ ہانکے جا رہے تھے۔ شراب نہ پے رہنے سے تھوڑی خوداعتمادی ضرور بیچ بیچ میں گڑ بڑا جاتی لیکن لوگوں کے چہرے پر تیر نے والا تجس اور دہشت انھیں پھر سے بولنے کا حوصلہ دے دیتی۔ وہ بول رہے تھے اور سوالیہ پر یشان چھرے انہیں سُن رہے تھے۔ یہ سلسلہ تبھی ٹوٹتا جب باہر سے گرتا پڑتا کوئی اور فرد گلی میں داخل ہو جاتا اور سننے والوں کی بھیڑ اسے گھیر لیتی۔ کرفیو لگنے کے بعد تین چار گھنٹے چوں کہ جم کر بارش ہوئی تھی اس لیے آنے والا بری طرح بارش میں نہایا ہوتا اور پاجامے یا پینٹ کے نیچے کا پائنچا گلی کی کیپڑ سے لت پت ہوتا۔ ہر آنے والا آتا اور کھوجی بھیڑ کے پاس کھڑے ہو کر کچھ نہ کچھ نئی بات بتاتا۔ جب تک اس کی بیوی یا بچے اسے گھسیٹ نہ لے جاتے تب تک وہ لوگوں کے چہرے پر کھنچی کشمکش اور بے یقینی کی لکیروں کا مزہ لیتا رہتا۔

پولیس اور پی اے سی کے سات آٹھ جوان ڈنڈے زمین پر پھٹکار نے گلی کے دہانے سے اندر گھسے ۔ان کے گھستے ہی لوگ ہڑ بڑا کر بھاگے۔ گرتے پڑتے لوگوں کو بھاگتے دیکھ کر پولیس والوں میں سے ایک دو کو مسخری سوجھی۔ انھوں نے اور زور سے لاٹھیاں زمین پر پینگیں اور ہوا میں گالیاں اچھالتے ہوے دوڑنے کا ناٹک کیا۔ لوگ اور زور سے بھاگے اور گلی کے کیچڑ اور نالیوں کے پاخانے میں پیر سانتے ہوے اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے۔ جن کے دروازے بند تھے انھوں نے انھیں بری طرح پیٹ ڈالا۔

گھروں میں بند ہو کر بچوں نے کھڑکیوں سے اپنی ناک سٹا دی اور آنکھیں باہر جمع پولیس والوں پر مرکوز کر لیں۔ عورتیں کواڑوں کی دراروں سے چپک گئیں۔ مرد اپنے مرد ہونے کے احساس سے دبے اپنی تشویش کی نمائش نہیں کر سکتے تھے اس لیے بند، اُمس بھرے کمروں میں پنکھے کے نیچے بیٹھے اپنے خارش زدہ بدن کھجلاتے رہے۔ بارش بند ہوے کافی دیر ہو چکی تھی اور ایک بار پھر سے امس پورے ماحول پر طاری ہو گئی تھی۔

پولیس والے باہر ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ اس بھگدڑ میں دیوی لالہ بھی ڈر کر ایک کوڑے کے ڈھیر کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ دن میں بھا گئے وقت دو چار لاٹھیاں ان کے پیر اور پیٹھ پر پڑی تھیں، اس لیے پولیس والوں کو دیکھ کر وہ ڈر گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ بد بودار کوڑے کو اپنی ناک پر جھیلتے رہے، پھر ہمت بٹور کر انھوں نے اُچک کر دیکھا۔ پولیس والوں میں ایک مقامی تھانے کا سپاہی بھی تھا جسے وہ مصر اکے نام سے جانتے تھے اور جس کے ساتھ بیٹھ کر انھوں نے کئی بار شراب پی تھی۔ مصر اکو دیکھتے ہی ان کی ہمت لوٹ آئی اور وہ کوڑے کے ڈھیر کو تقریبا ڈھکیلئے ہوے اٹھ بیٹھے۔

" ہے ہند پنڈت جی ! ہم تو بے کار ڈر رہے تھے۔"

کون ؟ دیوی لالہ ؟ جے ہند جے ہند۔ کہو کہاں چھپے ہو؟ کیسا محلہ ہے بھائی، سسُر پانی کو بھی ترس گئے۔ آج دوپہر سے ایک بوند پانی نہیں گیا حلق میں۔ کچھ چاے والے کا انتظام کرو بھائی۔"

دیوی لالہ جھپٹ کر ایک مکان کے بند دروازے پر پہنچے اور لگے دروازہ پیٹنے۔

” کون ہے ؟ کیا ہے ؟ گھر میں کوئی مردمانس نہیں ہے، اندر سے زنانی آواز آئی۔

"ہے کیسے نہیں ؟ ارے ہم خود دیکھا رام سنگھ کمپوزیٹر کو اندر آئے۔ بھائی ہم دیوی لالہ ہیں۔ باہر دروغہ جی کھڑے ہیں۔ کھولو دروازہ کھولو، پانی چاہیے۔"

رام سنگھ کمپوزیٹر نے تو نہیں لیکن دیوی لالہ کی آواز سے مطمئن ہو کر اس کی بیوی نے آدھا دروازہ کھولا۔

باہر لاٹھیوں اور بندوقوں کے ساتھ پولیس ان کے ساتھ تھی، اس لیے دیوی لالہ کافی جوش میں تھے۔ انھوں نے کڑک دار آواز میں ایک بار پھر سے رام سنگھ کو باہر آنے کو للکارا۔ رام سنگھ کی پتنی نے ایک بار پھر ممیانے ہوے بتایا کہ رام سنگھ گھر میں نہیں ہیں ، پر دیوی لالہ نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر میں بات اس پر ختم ہوئی کہ رام سنگھ کی گھر والی گرما گرم چائے بنا کر سب کو پلائے۔

چائے بن کر جب تک باہر آئی تب تک کچھ گھروں کی کھڑکیوں کے پلے آدھے پورے کھل چکے تھے۔ کچھ بچوں نے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن سپاہیوں نے انھیں ڈانٹ کر اندر کر دیا۔ ور پر جب چائے باہر آنے لگی تو دیوی لالہ نے رام سنگھ کے دو لڑکوں کو مدد کے لیے باہر بلا لیا۔ ان کی دیکھادیکھی بغل کے دو لڑکے اور نکل آئے۔ سپاہیوں نے بے من سے انھیں ڈانٹا اور پھر چائے پینے میں لگ گئے۔ لڑکے بھی ڈھیٹوں کی طرح پہلے اپنے دروازوں سے چپکے رہے اور پھر دھیرے دھیرے گلی میں اتر آئے۔ تھوڑی دیر میں بچوں کی اچھی خاصی بھیڑ پولیس والوں کے ارد گرد اکٹھی ہو گئی۔ وہ للچائی آنکھوں سے ان کے ہتھیار دیکھتے رہے اور ان ہتھیاروں کے نام ایک دوسرے کو بتاتے رہے۔ بیچ بیچ میں پولیس والوں میں سے کوئی انھیں جھڑک دیتا یا اپنی لاٹھی زمین پر پٹک دیتا۔ بچے بھاگتے اور تھوڑی دور پر پھر اکٹھے ہو جاتے۔ وہ کورس میں گاتے:

ہندو پولیس بھائی بھائی

کٹوا قوم کہاں سے آئی

پولیس والے ہنستے اور گالی والی دے کر پھر چائے پینے میں لگ جاتے۔ دیوی لالہ ان کے کھانے کا انتظام کرنے لگے۔ کرفیو ہر دوسرے تیسرے سال لگتا تھا۔ پولیس والے ہر بار اسی گلی میں یا بغل کی کسی گلی میں کھانا کھاتے۔ یہاں کھانا کھا کر محلے والوں سے کچھ ہنسی مذاق کرتے اور پھر پاکستانی گلیوں میں کرفیو لگانے چلے جاتے۔

گلی میں کوئی گھر ایسا نہیں تھا جو اکیلے اس پوری ٹکڑی کے لیے کھانے کا معقول انتظام کر سکتا۔ دیوی لالہ ایک ایک گھر کا حال جانتے تھے، اس لیے انھوں نے کسی گھر پوری چھنوائی، کہیں آلو کی بھیجیا تلی گئی اور دو ایک گھروں سے ڈانٹ کر اچار اور چٹنی اکٹھا کی گئی۔

پولیس والے جب تک کھانے بیٹھے تب تک کافی لوگ ہمت بٹور کر ان کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ ہندو لوگ تھے، اس لیے فطرتاً ملک کی سب سے زیادہ فکر انھیں ہی تھی۔ انھوں نے پولیس ٹکڑی میں اپنے جاننے والوں کو ڈھونڈا، یا نئے سرے سے تعارف حاصل کر لیا، اور انھیں پر جوش لہجے میں خفیہ طرز کی خبریں دینے لگے۔ کسی کو جانکاری تھی کہ پاکستانی گلی کے فلاں گھر میں ٹرانسمیٹرلگا ہوا ہے جس سے ایک ایک پل کی خبر بھیجی جا رہی ہے ، اسی لیے تو جو دنگا دو پھر بعد ہوا اس کی خبر شام کو بی بی سی سے آ گئی ۔ جو ذات شریف ٹرانسمیٹر والی جانکاری دے رہے تھے۔ ان سے ایک آدھ حاسد پڑوسیوں نے پوچھا بھی کہ انھوں نے بی بی سی کب سنا، لیکن باقی سب نے مان لیا کہ بی بی سی نے ضرور یہ خبر دی ہو گی۔ کچھ لوگوں نے پاکستانی گلی کے کچھ مکان بتائے جن میں ان کے مطابق ہتھیاروں کے ذخیرے تھے۔ ان ہتھیاروں کی تفصیل لوگوں نے اپنی اپنی عام معلومات کے مطابق الگ الگ دی۔ زیادہ تر لوگوں نے سنیما اور اخباروں میں پستولوں اور بموں کے بارے میں پڑھا تھا، اس لیے اس کے مطابق ان میں پستولوں اور بموں کو اکٹھا کیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے اسٹین گن بھی چھپائے جانے کی خبر دی۔ پولیس والوں نے خبر یں اکٹھی کیں۔ وہ ہر بار دنگوں میں پاکستانیوں کو سبق سکھاتے تھے۔ اس بار بھی یہ خبریں ان کے کام آنے والی تھیں۔

پولیس والوں نے کھانا کھایا اور نالیوں پر کھڑے ہو کر ہاتھ منہ دھویا۔ وہ تھوڑی دیر تک دانت وانت کھودتے رہے، پھر بغل والی گلی میں پاکستانیوں کو سبق سکھانے چلے گئے۔

رات کافی ڈھل چکی تھی۔ عام طور سے اس وقت تک یہ گلی تھک تھکا کر سو جاتی تھی، لیکن آج گلی میں گھروں، سیڑھیوں اور چبوتروں پر لوگوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ اکٹھے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ گلی کی نالیوں پر چار پائیاں نہیں پڑھی تھیں۔ باوجود اس کے کہ یہ ہندوؤں کی گلی تھی اور کرفیو صرف اس حد تک لگا تھا، کہ لوگ گلیوں کے باہر بڑی سڑک تک نہیں جا سکتے تھے، پھر بھی امس بھری رات میں گھر کے اندر سونے کو مجبور تھے۔ گھروں کے اندر جانے کا خیال ہی ناقابل برداشت تھا اس لیے لوگ باہر گلی میں بیٹھ گئے اور گپ لڑاتے رہے۔ دوسرے وہ مطمئن تھے؛ گلی میں بیٹھنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہاڑی کمانے والے ضرور پریشان تھے کہ اگر کرفیو تین چار دن چل گیا تو گھر میں جلنے والے چولھے کی رفتار مدھم ہوتی جائے گی۔ پچھلے برسوں میں جب تک شہر کے حکمرانوں کو لگتا کہ شہر کو اچھی طرح سبق نہیں سکھایا گیا ہے، تب تک وہ کرفیو اٹھانے کو ٹالتے جاتے۔ دو تین لگاتار کرفیو جاری رہتے تو دہاڑی والے واویلا کرنے لگتے۔

گلی کے ایک کونے پر اچانک دو تین پتھر کسی دروازے سے ٹکرائے۔ سیڑھیوں ، چبوتروں پر بیٹھے لوگ ہڑ بڑا کر بھاگے۔ کچھ لوگ نالیوں میں پھنس کر گر گئے۔ کچھ عور توں نے چیخنا شروع کر دیا۔ بچوں کو سنبھالنے کے چکر میں عور تیں گر گر پڑیں۔ لیکن یہ بد حواسی چند منٹوں کی رہی۔ جلد ہی لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ گلی پر باہر سے کوئی حملہ نہیں ہوا بلکہ گلی کے کنارے اکٹھے بیٹھے لڑکوں ہی نے اٹھ کر یوسف درزی کے مکان کے بند دروازے پر دو تین اوھے مار دیے تھے۔ یوسف درزی اس گلی میں اکیلا مسلمان تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد اس کے سبھی بھائی پاکستان چلے گئے، صرف وہی رہ گیا تھا۔ ہر فساد میں اس کی بیوی اسے تیس پینتیس سال پرانی بے وقوفی پر کوسنے لگتی اور ہر دنگے میں وہ فیصلہ کرتا کہ اس گلی کا مکان بیچ کر وہ کسی محفوظ جگہ پر مکان لے لے گا، لیکن ہر بار فساد ختم ہونے کے بعد وہ دو تین دن سبھی جگہ پر مکان ڈھونڈتا اور پھر چپ چاپ سر جھکا کر کپڑے سینے لگتا۔ فساد میں یوسف درزی کے خاندان کے لیے صرف یہی فرق پڑتا کہ وہ اپنے مکان میں قید ہو جاتا۔ مکان چاروں طرف سے بند کر دیا جاتا۔ دروازوں پر تختے اور چار پائیاں لگا دی جاتیں اور گھر کے کمروں میں لوگ چپ چاپ سن ہو کر بیٹھ جاتے۔

یوسف درزی کے نو بچے تھے۔ ان میں کچھ لڑکیاں تھیں۔ لڑکیاں مختلف عمروں کی تھیں اور اپنی اپنی عمر کے مطابق لفڑوں میں گھری تھیں۔ وہ لفڑے محلے کے تمام لڑکے لڑکیوں کے لفڑوں کی طرح تھے، جو اسکول جانے کی عمر سے شروع ہوتے تھے اور شادی ہوتے ہی ختم ہو جاتے تھے۔ آج تک تو اس گلی میں ایسا ہوا نہیں کہ جس کے ساتھ چھپ چھپا کر آنکھیں لڑائی گئی ہوں ، کتا ہوں کاپیوں میں چھپا کر چٹھیاں بھیجی گئی ہوں، اسی سے شادی ہو گئی ہو۔ مستقبل میں بھی ایسا ہونے کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ اس لیے یوسف درزی کی لڑکیاں اسکول جاتے جاتے یا اپنے گھر کی کھڑکی دروازے پر کھڑے ہو کر بے خیالی میں لڑکوں کو دیکھ کر مسکرا دیتیں یا آنکھیں نیچی کر کے تیزی سے بغل سے نکل جاتیں۔

آج بھی کرفیو لگنے سے پیدا ہوئی بوریت کو دور کرنے کے لیے وہ لڑکیاں باری باری سے کھڑکی پر آکر بیٹھ جاتیں اور نیچے گلی میں چبوترے پر بیٹھے لڑکوں کی سیٹیوں اور پھبتیوں پر مسکرا کر ہٹ جاتیں۔ یوسف درزی کا پشتینیی مکان اس محلے کے مکانوں کے لحاظ سے کافی بڑا تھا۔ نیچے دو کمرے تھے، آنگن تھا اور باورچی خانہ تھا۔ اوپر ایک کمرہ تھا اور کھلی چھت تھی۔ چھت کی دیوار میں ضرور یوسف نے اپنی لڑکیوں اور دنگوں کی وجہ سے کافی اونچی کرا دی تھیں۔

پورے گھر میں سہما ہوا سناٹا تھا۔ پوسٹ اور اس کی بیوی نے باہری دروازہ بند کر کے اس پر تختے اور چار پائیاں کھڑی کر کے مضبوطی کر دی تھی۔ یوسف کرفیو لگتے ہی بڑی مشکل سے گرتا پڑتا اپنی دکان بند کر کے گھر آیا تھا۔ وہ کافی دیر تک گھر کے دروازے بند کر کے اوندھے منہ بستر پر پڑا رہا۔ اس کی بیوی دبے لفظوں میں اسے کوستی رہی۔ لڑکے لڑکیاں سہمے سہمے کونوں کھدروں میں دبکے رہے۔ اندھیرا ہونے پر لڑکیاں باری باری سے اوپر کمرے میں کھڑکی تک آنے جانے لگیں۔ ماں نے کھانا پکانا شروع کیا اور لڑکیوں میں سے دو ایک کو دھول دھپے لگا کر اپنے ساتھ رسوئی میں لگا لیا۔ باپ بیچ بیچ میں ذرا بھی شور ہونے پر دانت پیس پیس کر لڑکوں کو گالیاں دیتا۔

کھانا بن جانے پر یہ سلسلہ ٹوٹا اور پورا خاندان بچے اکٹھا ہو کر کھانا کھانے بیٹھا۔ بیوی پروستی رہی اور یوسف درزی اپنی عادت سے مجبور سر جھکا ئے کھاتا رہا۔ بچے بھی اس کی موجودگی سے خائف ہو کر بنا کچھ بولے کھانا کھاتے رہے۔ اس بیچ باہر چبوترے پر بیٹھے لڑکوں کا صبر جواب دے گیا۔ انھوں نے پہلے تو ایک آدھ کنکریاں اوپر کھڑکی پر پھینکیں، اور جب کوئی لڑکی کھڑکی پر نہیں آئی تو تین چار ادھے اور پوری اینٹیں دروازے پر دے ماریں۔

دروازے پر اینٹ لگتے ہی جو بھڑ بھڑ کی آوازیں ہوئیں انھوں نے یوسف درزی کے پورے خاندان کو خوف کے سمندر میں ڈبو دیا۔ چھوٹے بچوں نے رونا شروع کر دیا۔ یوسف نے دہشت بھری آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے پر چار پائیاں رکھی تھیں لیکن پھر بھی اگر باہر سے دباو پڑتا تو پرانے وقت کی مار کھا یا دروازہ کتنی دیر تک رک پاتا۔ اس نے اپنے چھوٹے لڑکے کو کچھ اشارہ کیا اور اس نے کھڑکی بند کر دی۔ یوسف اور اس کی بیوی نے دو تین بھاری سامان اور اٹھا کر دروازے سے لگا دیے۔ بچوں کے نوالہ نگلتے ہاتھ رک گئے اور انھوں نے اپنی خوف زدہ آنکھیں دروازے پر ٹکادیں۔

باہر گلی میں بھی اینٹوں کی آوازوں نے لوگوں کو کچھ دیر کے لیے تہہ و بالا کر دیا۔ لیکن جلد ہی لوگوں کی سمجھ میں آگیا کہ یہ کوئی باہری حملہ نہیں تھا بلکہ گلی کے ہی لڑکوں نے یوسف درزی کے مکان پر پتھر پھینکے تھے۔

لوگوں نے لڑکوں کو گالیوں سے جھڑ کا۔ جو لوگ دوسری گلیوں کے مسلمانوں کے یہاں پاکستانی ٹرانسمیٹر اور ہتھیاروں کا ذخیرہ ہونے کا بیان کر رہے تھے انھیں کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ کیسے اپنی گلی کے مسلمان کے مکان پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک ساتھ اتنے لوگ لاکار نے لگے کہ شرارتی لڑکے سہم کر دبک گئے۔

گلی والوں کو بھی احساس ہوا کہ افراتفری میں اس اکیلے مکان کو وہ بالکل بھول گئے تھے۔ وہ مکان کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ دو تین نے الگ الگ آوازیں لگا کر پوسف کو دروازہ کھولنے کو کہا۔ اندر سے کوئی آہٹ نہیں آئی۔

آج پہلا دن ہے، آج دروازہ نہیں کھولیں گے، کسی نے کہا۔ بات صحیح تھی کیوں کہ پہلےبھی کرفیو کے دوران دو ایک دن تک یوسف کے گھر کا دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ "یوسف بھائی گھبرانا نہیں ، ہم لوگ یہاں ہیں، '' دیوی لالہ نے اپنی شراب کی پیاسی زبان کی اینٹھن کو دباتے ہوے کہا۔ لڑکوں نے وہ بات پکڑلی۔ انھوں نے چلبلی آواز میں گانا شروع کیا۔

یوسف تم سنگھرش کرو، ہم تمھارے ساتھ ہیں

ابھی ابھی چناو ختم ہوا تھا اور نعرہ لڑکوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ بڑوں نے انھیں جھڑکنے کی کوشش کی پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ لوگ الگ الگ گروہوں میں تتر بتر ہو گئے۔

تھوڑی دیر میں اوپر والی کھڑ کی کھل گئی اور لڑکے بھی نیچے سامنے والے چبوترے پر جم گئے۔

۴

کرفیو کا دوسرا دن تھا اور سعیدہ کی بیٹی پوری طرح پست ہو گئی تھی۔ اگست کی سرڑی گرمی نے لگاتار بند کمرے کو جہنم میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس جہنم میں گھری عورتوں اور مردوں کے جسموں کی خوشبو کے ساتھ بچوں کے پاخانے کی بد بو بھی شریک ہو گئی تھی۔ ۱۳ ضرب ۸ فٹ کے کمرے اور اس کے ساتھ لگے ۸ ضرب ۵ فٹ کے برآمدے میں لوگ قید تھے۔ اس میں سعیدہ، اس کا شوہر، اس کی ساس اور سسر ، اس کی ایک بڑی نند ، دو چھوٹے دیور ایسے تھے جنھیں بڑا کہا جا سکتا ہے؛ اس کی نند کا سات سال کا لڑکا اور اس کی دو بیٹیاں ، تین ذی روح ایسے تھے جن کی گنتی چھوٹوں میں ہو سکتی تھی۔

اپنے گاؤں سے جب سعیدہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی تو بہت ساری چیزوں سے وہ مانوس نہیں ہو پائی تھی۔ وہ محلہ جسے منہاج پور کے نام سے پکارا جاتا تھا، خاص طور سے مسلمانوں کا محلہ تھا اور اکثر مسلم محلوں کی طرح غریبی، گندگی اور جہالت سے جیجاتا رہتا تھا۔ بڑی مشکل سے سعیدہ یہ بات سمجھ پائی کہ یہ چھوٹا سا کمرہ اس کا پورا گھر ہے۔ اس کمرے میں ساس، سسر، دیور، نند کی موجودگی میں اسے اپنی ازدواجی زندگی کی شروعات کرنی تھی۔ شروع شروع تو وہ پڑ جاتی تھی۔ ایک کمرے کے اس گھر میں پیچھے کی طرف ایک برآمدہ تھا جس سے ملا ہوا چھوٹا سا پاخانہ تھا۔ اس پر ایک ٹاٹ کا پردہ ٹنگا رہتا تھا اور کھانے والا نہ ہونے کی وجہ سے کبھی بھی یہ پوری طرح سے صاف نہیں ہوتا تھا۔ ایک خاص طرح کی بد بو اس سے ہمیشہ نکلتی رہتی تھی۔ سعیدہ کو اس بد بو کے ساتھ جینے کی عادت ڈالنے میں کئی مہینے لگ گئے۔

اسی بر آمدے میں سعیدہ کو شادی شدہ زندگی کا ابتدائی سکھ حاصل ہوا۔ پہلی رات کو چھوڑ کر جب اس کے ساس سسر سبھی کو لے کر باہر گلی میں نالے پر سونے چلے گئے تھے، باقی تقریباً روز ہی کوئی نہ کوئی کمرے میں موجود رہتا، کبھی کبھی تو پورا کنبہ ہی اندر موجود رہتا۔ سعیدہ کا شوہر برآمدے میں زمین پر بستر بچھا کر پڑا رہتا اور بے چینی کے ساتھ سعیدہ کا انتظار کرتا۔ وہ دیر ہونے پر مضحکہ خیز انداز میں کھانستا اور اس کی کھانسی کی آواز سن کر سعید و کا بند بند کاٹھ کی طرح تن جاتا۔ اسے شوہر کی بے حیائی پر بے حد غصہ آتا اور اس کا غصہ تب تک رہتا جب تک وہ دھیرے سے اٹھ کر زمین پر پورے کمرے میں سوئے لوگوں کو لانگھتی پھلانگتی اپنے شوہر کی بغل میں جا کر لیٹ نہ جاتی۔

کرفیو کا دوسرا دن تھا اور سعیدہ کو چھوڑ کر گھر کے باقی سبھی افراد کو معلوم تھا کہ ابھی اگلے کئی دنوں تک اس میں چھوٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ شہر کے حکام کبھی کبھی سبق سکھانے کے لیے کرفیو کئی دنوں تک نہ بٹانے کے اصول پر یقین رکھتے تھے اور جب انھیں یہ اطمینان ہو جاتا کہ انھوں نے کافی سبق سکھا دیا ہے تبھی وہ کرفیو ہٹاتے۔

بند کمرے میں پڑے رہنے سے سعیدہ کو دو دقتیں محسوس ہورہی تھیں۔ ایک تو اس کی بٹیا کی بیماری تھی جس کو دیکھ کر اس کی قیافہ شناس ساس کو لگ رہا تھا کہ اس کے بچنے کی امید بہت کم ہے۔ اس کی ساس نے کل گیارہ بچے پیدا کیے تھے جن میں سے سات مر چکے تھے۔ بچوں کو مرتے دیکھنے کا اسے کچھ ایسا تجربہ تھا کہ اسے اب کسی بھی مرتے ہوے بچے کو دیکھ کر اس کی ہونے والی موت کا احساس ہو جاتا تھا۔ سعیدہ کی دوسری دقت بڑی عجیب قسم کی تھی۔ وہ جس ماحول سے اس شہر میں آئی تھی، وہاں اس طرح کی دقت کا خیال بھی اس کے لیے مضحکہ خیز تھا۔ وہاں روز صبح منہ اندھیرے المونیم کا لوٹا ہاتھ میں لیے اپنی کسی بہن یا پڑوسن کے ساتھ وہ دور کھیتوں میں نکل جاتی۔اس کے گاؤں میں دو ایک زمیندار گھروں کو چھوڑ کر باقی کسی کے گھر میں پاخانہ نہیں تھا۔ عورتیں صبح شام اندھیرے میں کھیتوں میں چلی جاتی تھیں۔ جن دنوں کھیت خالی ہوتے ان دنوں وہ کسی چھوٹی موٹی جھاڑی یا اونچی مینڈ کے پیچھے چھپ جاتی تھیں۔ اس عادت میں تبدیلی بھی آتی تھی، جب بارش پڑتی تھی یا جب کسی کا پیٹ خراب ہو جاتا تھا۔

سعیدہ کی ساس نے اسے پہلے ہی دن بتا دیا تھا کہ یہاں اسے کیا کرنا پڑے گا۔ اس کے ساس سسر دیہات سے آ کر اس گلی میں بسے تھے، اس لیے اس کی ساس جانتی تھی کہ گاؤں سے پہلی بار آنے پر عورت کے سامنے کیا کیا دقتیں آسکتی ہیں۔ پہلی ہی شام سعید و گھر کے سنڈاس میں گئی تو الٹیاں روکتے روکتے اس کا برا حال ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے بری طرح پانی بہنے لگا تھا اور کھٹی پت بھری رال اس کے ہونٹوں کے کونوں سے رس رس کر اس کے کپڑے ہنگو گئی۔ سنڈاس ۶۔ ضرب ۳ فٹ کا کمایا جانے والا پاخانہ تھا، جس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ اس میں مشکل سے کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ اندھیرے سیلن بھرے اس کمرے میں ایک تیز بد بو ہر وقت اٹھتی رہتی تھی اور اس کا دروازہ کھلتے ہی یہ بد بو پورے گھر پر بھپکے کی طرح چھا جاتی تھی۔ دروازہ بند ہونے پر بھی گھر کے پورے جغرافیے پر یہ بد بو ایک دھیمے غلاف کی طرح چھائی رہتی تھی۔ اس بد بو کے ساتھ جینے کے لیے اس سے واقف ہونا ضروری تھا اور یہ واقفیت حاصل کرنے میں سعیدہ کو مہینوں لگ گئے۔

سنڈاس دن میں ایک بار صاف ہوتا تھا۔ سعیدہ نے شروع میں چالاک بننے کی کوشش کی۔ صبح ساڑھے سات بجے تک بھنگی آجاتا تھا۔ بنا بولے دروازے کے باہر سیڑھیوں پر وہ خاص ڈھنگ سے جھاڑو پٹکتا، جھاڑو کی آواز اس کے آنے کا اشارہ تھی اور اس آواز پر سعیدہ کا دیور یا ساس اٹھ کر دیکھ آتی کہ پاخانے میں کوئی گیا تو نہیں ہے۔ اس میں کسی کے ہونے یا اس کے خالی ہونے کی اطلاع بھنگی کو دے دی جاتی۔ پاخانے کی صفائی کے لیے پیچھے گلی میں جانا پڑتا تھا جہاں پاخانے کے نیچے کا قریب قریب ایک مربع فٹ چھوٹا سا حصہ کھلتا تھا۔ اسے ڈھکنے کے لیے ٹین کا ایک ٹکڑا کیلوں کے سہارے جڑا ہوا تھا۔ وقت کی مار نے اس ٹین کے ٹکڑے کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ بھنگی کو روز اس ٹین کے ٹکڑے کو کھولنے یا بند کر نے میں یہی ڈر لگتا تھا کہ دوسرے دن یہ ٹکڑا اسے صحیح سلامت ملے گا بھی یا نہیں۔ سعیدہ نے پانچ سات ہی دن میں بھنگی کے معمولات سمجھ لیے۔ وہ صبح ہی سے دھیان لگا کر بیٹھی رہتی اور جیسے ہی بھنگی صفائی کر کے بٹتا وہ سنڈاس کی طرف جھپٹتی۔ وقت صرف اتنی تھی کہ اسے روز بہت سویرے پاخانے جانے کی عادت تھی۔ صبح سات ساڑھے سات تک انتظار کرنا کافی تکلیف دہ محسوس ہوتا تھا۔ اپنے اوپر قابو رکھنے کے لیے اسے طرح طرح کی حرکتیں کرنی پڑتی تھیں۔ اکثر اس کا پورا جسم اکڑ جاتا۔ جلد ہی اس کی ساس نے اس کی یہ حرکت پکڑ لی۔ اس کی ساس کو یہ بہت برا لگا کہ چار دن پہلے گھر میں آئی لونڈیا اپنے کو خاندان کے دوسرے لوگوں سے برتر سمجھے اور ایسا برتاؤ کرے جس سے دوسرے لوگ اپنے کو کمتر سمجھیں۔ اس نے ایک دن صبح صبح سعیدہ کو ایسی چنی چنی گالیاں دیں کہ وہ شرم اور گھبراہٹ میں کافی دیر تک اپنے پیروں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔

لیکن اس کی ساس، جو اس کی ساس کے علاوہ پھوپھی بھی تھی ، جلد ہی پسیج گئی۔ اس نے دو تین بار دیکھا کہ سعید ہ ابتر حالت میں سنڈاس سے نکلتی ، اس کی آنکھوں سے بری طرح پانی نکلتا رہتا اور الٹی روکنے کی کوشش میں اس کے منہ سے رال کی شکل کا مادہ گرتا رہتا۔

سعیدہ کے گھر کے پاس جہاں گلی ختم ہوتی تھی وہاں ایک پلاٹ خالی پڑا تھا۔ اسے کسی نے گھر بنوانے کے لیے نیو بھروا کر پچھلے کئی برسوں سے خالی چھوڑ رکھا تھا۔ اس کے پیچھے نالا تھا جو کافی دور تک گلی کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا اثر کی طرف نکل جاتا تھا۔ یہ پلاٹ اور نالادن بھر محلے کے بچوں کی آوارہ گردی اور کھیل کود کا اڈا بنا رہتا۔ سعیدہ کی ساس صبح منہ اندھیرے اسے لے کر اسی میں جانے لگی۔ کبھی وہ پلاٹ کے کسی کونے میں بیٹھ جاتی اور کبھی نالے کے کنارے چلی جاتی۔ نالے کے کنارے اترنے کے لیے ڈھلان سے اترنا پڑتا تھا، اس لیے اکثر ساس بہو ہاتھ پکڑ کر ایک دوسرے کو سہارا دیتیں۔ بڑھیا ساس ایک دو بار گر کر اپنے ٹخنوں میں موچ بھی لگا بیٹھی۔ ہر بار گرنے پر وہ سعیدہ کو کوستی اور بیٹھے بیٹھے یا چلتے چلتے اتنی گالیاں دیتی کہ سعیدہ روہانسی ہو جاتی۔

اس پورے معمول میں دقت یہ تھی کہ ساس بہو کو صبح بہت سویرے اٹھنا پڑتا۔ انھیں کسی رات گیارہ بجے سے پہلے سونا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ سعیدہ کو تو اس کے بعد بھی اپنے شوہر کے لیے ایک آدھ گھنٹے تک جاگنا پڑتا۔ اس کے بعد اتنے سویرے اٹھنے کا مطلب تھا پورا دن اونگھتے ہوے بتانا۔ ساس نے تو پانچ سات ہی دن میں تو بہ بول دی، مگر سعیدہ کو اکیلے جانے کی اجازت دے دی۔ سنڈاس میں بیٹھنے کا خیال ہی اتنا آبکائی بھرا تھا کہ وہ روز صبح صبح مقررہ وقت پر اٹھ بیٹھتی۔ کبھی کبھی شوہر رات کو دیر تک سونے نہ دیتا تو باقی بچے تین چار گھنٹے سعیدہ کے اس دہشت میں نکل جائے کہ کہیں سورج نکل آئے اور اس کی آنکھ نہ کھلے۔ وہ نیم غنودہ حالت میں رہتی اور بیچ بیچ میں چونک کر اٹھ جاتی اور اپنے شوہر کی کلائی میں آنکھیں گڑ گڑا کر وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی۔ رات بھر وہ اسی طرح سوتی اور دن بھر ساس کی گالیاں سنتی۔

کرفیو کے دوسرے دن گھر بھیجا تے سنڈاس اور اُمس بھری گرمی میں، ایک ایسے دوزخ میں تبدیل ہو گیا جس میں زندہ رہنے والے افراد کے لیے پسینے اور بدبو سے پست وجود کو ڈھونا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ سعیدہ نے ٹاٹ کا پردہ بٹا کر اندر گھسنے کی کوشش کی اور تقریباً قے کرتی ہوئی باہر بھاگی۔ پورا دن ہو گیا تھا اور وہ ایک بار بھی سنڈاس نہیں گئی تھی۔ صبح سے وہ کچھ نہیں کھا رہی تھی۔ مارے ڈر کے اس نے چاے بھی نہیں پی تھی۔

سعیدہ کی لڑکی دن بھر اپنی دادی کی گود میں پڑی رہی تھی۔ دو سال کی لڑکی تین دن کی پیچش سے بے حال ہو گئی۔ آج دو پھر بعد سے اسے الٹیاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ سڑی گرمی اور گندگی نے اسے ہیضے کا شکار بنا دیا ہے۔ صرف دادی اور ماں اس کے بارے میں پریشان تھیں۔ دادا اور باپ کمرے کے ایک کونے میں اکڑوں بیٹھے بیڑیاں بنانے میں اس قدر مشغول تھے کہ اس اندھیرے سیلن بھرے کمرے میں اچانک کوئی روشنی میں سے آتا تو انھیں بھوت سمجھنے کی بھول کر بیٹھتا۔ چاروں طرف سے بند کمرے میں ان کے ننگے بدن پر پسینا بری طرح چپچپا رہا تھا اور ان کے پیشہ ور ہاتھ پتوں تمباکو اور دھاگوں پر مضراب کی طرح چل رہے تھے۔ سعیدہ کے دونوں دیور اور اس کی نند کا لڑکا کمرے کے دوسرے کونے میں بیٹھے کیرم بورڈ کھیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھر میں یہی ایک تفریح کا سامان تھا اور صبح سے اسے کھیلتے کھیلتے لڑ کے بور ہو گئے تھے۔ وہ کھیلتے، جھگڑتے، کھیلنا بند کر دیتے، اور پھر کھیلنے لگتے۔ صبح سے یہی چل رہا تھا۔ آج چوں کہ بیڑی بنانے کا سامان کم تھا اس لیے انھیں کھیلنے کے عوض میں لاتیں، گھونسے یا گالیاں نہیں مل رہی تھیں۔ ڈیڑھ کمرے کے مکان میں صرف سعیدہ کی نند چل پھر رہی تھی اور گھر کے لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنے میں لگی تھی۔

سعیدہ دو دن کے لیے دوالائی تھی اور گھبراہٹ میں اس نے ایک ہی دن میں اسے پلا دیا تھا۔ دو پہر تک دوا ختم ہو گئی۔ سعیدہ نے کئی بار مجبور اور لاچار نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ایک آدھ بار اس نے اپنے سسر کا لحاظ چھوڑ کر شوہر سے باہر جا کر دوا لانے کی گڑگڑاہٹ بھری خوشامد بھی کی، لیکن اس کا شوہر اور سسر بے حسی سے اپنے کام میں لگے رہے۔

شوہر کو سویرے بڑا تلخ تجر بہ ہوا تھا، اس لیے اب وہ باہر جانے کی کوئی التجا سننے کو تیار نہ تھا۔ صبح پانی کے لیے اسے باہر نکلنا پڑا تھا۔ گھر میں ایک نل تھا جس میں صبح اور شام کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے پانی بوند بوند ٹپکتا تھا۔ پانی کی باقی ضرورت گلی کے منہ پر لگے عام نل سے پوری ہوئی تھی۔ روز صبح اور شام وہاں کہرام مچا تھا؛ عور تیں ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی ، اپنی اپنی بالٹی کو آدھا تہائی بھرتی تھیں۔ گلی کے زیادہ تر مکانوں میں ایک دو ٹونٹیوں سے زیادہ نہیں تھیں جن سے جاڑوں میں بھی لوگوں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی۔ پھر اس وقت تو بلا کی گرمی تھی جس میں آدمی کے حلق میں ہر وقت کانٹے لگے رہتے ہیں، اس لیے سعیدہ کے شوہر نے اپنی ماں کے کہنے پر جوکھم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ پچھلے دن دو پہر میں کرفیو لگنے کے بعد سے ایک بوند پانی باہر سے گھر میں نہیں آیا تھا۔ گھر کے نل میں روز کی طرح اتنا پانی ٹپکا تھا کہ سویرا ہونے مشکل سے ڈیڑھ بالٹی پانی بجا تھا۔ اس لیے ماں کے کہنے پر وہ بالٹی ہاتھ میں لیے باہر گلی کے ٹھنڈے اندھیرے میں اُتر گیا۔

تقریباً بارہ گھنٹے اُمس بھرے کمرے میں بند رہنے کے بعد کھلے پن میں نکلنا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ ابھی پو نہیں پھٹی تھی اور گرمی کی صبح ٹھنڈی بسیار کے ساتھ تازگی دے رہی تھی۔ پوری گلی میں سناٹا تھا اور رات میں گلی کے ایک ایک انچ میں پڑی رہنے والی چار پائیاں جانے کہاں رخصت ہو گئی تھیں۔ روز کی تنگ گلی آج کافی کھلی اور چوڑی نظر آرہی تھی۔ زندہ ہستیوں کے نام پر صرف کتے تھے۔ روز رات بھر گلی میں جگالی کرتی گھومنے والی گائیں بھی کرفیو کی زد میں آ گئی تھیں اور لاپتا تھیں۔

وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بالٹیاں لٹکائے سہمی سہمی چال سے آگے بڑھا۔ نل قریب سو گز دور تھا۔ تھوڑا ہی آگے بڑھنے پر پانی کی آواز آنے لگی۔ نل کھلا ہوا تھا اور صبح صبح تیز رفتار سے پانی آنے کی وجہ سے اس کے زمین پر گرنے کی آواز یہاں تک آرہی تھی۔ روز ہی کی طرح رات میں نل بند نہیں کیا گیا تھا اور روز ہی کی طرح پانی تیز رفتار سے زمین پر گر رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ روز اس وقت تک اکاد کا عورتیں بالٹیاں لیے نل کی طرف جاتی یا واپس آتی دکھائی دے جاتی تھیں جب کہ اس وقت وہ بالکل اکیلا تھا ۔

دس پانچ قدم چلنے کے بعد اس کا ڈر دھیرے دھیرے ختم ہونے لگا۔ وہ مستی میں آنے لگا۔ رات بھر کی بے کیفی نے اس کے جسم میں جو اکڑن بھر دی تھی، صبح کی ٹھنڈی بیار نے اسے دور کر کے تازگی پیدا کر دی۔ وہ دھیرے دھیرے گنگنانے لگا۔ اپنے آپ سے بے خبر جب وہ نل کے قریب پہنچا تو اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ اونچی آواز میں گا رہا ہے۔ اس نے نل کے نیچے بالٹی لگانے سے پہلے پانی کی ٹھنڈی دھار اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹ کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی اتنی تیز رفتار سے آ رہا تھا کہ لاکھ بچاتے بچاتے اس کی لنگی اور بنیان بھیگ گئی۔ پانی ٹھنڈا تھا اور اس کا لمس تن میں سکھ اور جُھر جھُری ایک ساتھ پیدا کر رہا تھا۔

پتا نہیں اس کی اونچی آواز کا اثر تھا یا صبح صبح ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھونے کا، ایک دو پولیس والے اونگھتے آلساتے وہاں نمودار ہوئے۔ اسے ان کے وہاں ہونے کا پتا تب چلا جب انھوں نے گالیوں اور ڈنڈوں کی بوچھار ایک ساتھ شروع کر دی۔ مادر- سالے، کرفیو میں یہاں اپنی ماں - آیا ہے! اس جملے کے ساتھ دنادن اس کے پیروں اور کولھوں پر ڈنڈے پڑنے لگے ۔ اس کی دوسری بالٹی آدھی بھری تھی۔ وہ لڑکھڑا کر ایک طرف کو جھکا اور پھر سنجل کر اس نے دونوں بالٹیاں اٹھائیں اور گھر کی طرف بھاگا۔ دونوں پولیس والے شاید رات بھر ڈیوٹی دینے کے بعد اتنے تھکے ہوے تھے کہ انھیں اس کے پیچھے بھاگنے میں کوئی نتیجہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے اپنا چلو نل میں لگا کر پانی پینا شروع کر دیا اور دوسرا کھڑا ہوا اسے ماں بہن کی گالیاں دیتا رہا۔ بھاگتے بھاگتے وہ دو تین بار لڑکھڑایا۔ جگہ جگہ اس کی بالٹیوں کا پانی چپکتا رہا اور راستے بھر اسے ایسا لگتا رہا جیسے اس کے پیچھے دونوںیم دوت دوڑتے چلے آ رہے ہوں۔ جب وہ گھر کے اندر گھسا تو اس کی دونوں بالٹیوں میں دو دو چار چار لوٹے پانی بمشکل رہ گیا تھا۔

اس لیے سعیدہ کے کئی بار اشارے سے اور کئی بار صاف صاف کھنے کے باوجود اس کے دل میں باہر نکل کر لڑکی کے لیے دوالانے کے لیے کوئی جوش پیدا نہیں ہوا۔ وہ سر جھکائے اپنے کام میں لگارہا۔

سعیدہ نے بھی جھنجھلا کر اپنے شوہر سے بولنا بند کر دیا۔ بیچ بیچ میں جب اس کی بیٹی اپنی دادی کے اوپر الٹی یا دست کر دیتی تو وہ اٹھتی اور پانی کے ساتھ پوری کنجوسی برتتے ہوے ساس کی ساڑھی یا بدن پونچھ دیتی۔ اس کی ساس نے کئی بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دھیرے دھیرے مرتے دیکھا تھا؛ اس کے لیے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں تھا کہ یہ بھی بھی اب مر رہی ہے۔ چھوٹی سی بچی کو مرتے ہوے دیکھنا بطور ماں کے سعیدہ کا پہلا تجربہ تھا۔ اس نے شہر میں آکر کئی فلمیں دیکھی تھیں جن میں اکثر عورتیں اپنے مرحوم بچوں کی یاد میں گانے گاتیں اور بچوں کی بھولی شرارتوں کے تصور میں ڈوبی رہتیں۔ سعیدہ نے اپنی بٹیا کی شرارتیں یاد کرنے کی کوشش کی، پر اسے ہر بار مایوسی ہوئی۔ جو چیز اسے یاد آرہی تھی وہ بھوک، دھول اور بہتی ناک کا کچھ ایسا ملا جلا ملغوبہ تھا جس سے فلمی ماں کی مکمل حقیقت کا کوئی ماحول نہیں بن پا رہا تھا۔ اسے بار بار یاد آرہا تھا، اس بٹیا کی پیدائش پر اس کی چھاتیوں میں دودھ نہیں اترا تھا۔ سال بھر کی اس کی پہلی بیٹی ابھی تک اس کی چھاتی بھنبھوڑتی تھی پر اس بیٹی کے جنم سے کچھ دن پہلے سے اس کی ساس نے بڑی بیٹی کو ڈانٹ پھٹکار کر یہ عادت چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ بڑی بیٹی روتی رہتی اور وہ چھوٹی کو اپنی چھاتیوں سے چپکائے رہتی۔ دودھ پتا نہیں اس بار کیوں نہیں اتر رہا تھا۔ لاچاری، غریبی اور مشقت سے ٹوٹا ہوا اس کا بدن اسے پوری طرح سے ماں بننے سے روکتا تھا۔ وہ جھنجھلا کر اپنی دونوں بیٹیوں کو زمین پر ساتھ ساتھ لٹا دیتی اور خود گھر کے کام کاج میں لگ جاتی۔ دونوں بیٹیاں گلا پھاڑ پھاڑ کر روتیں اور روتے روتے بے دم ہو جاتیں۔ گھر کے ذی روح سر جھکائے بیڑی بناتے رہتے۔ بچوں کا اس طرح رونا اس گھر کے ماحول میں ایسی جانی پہچانی صورت حال تھی کہ انھیں اپنا کام چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہونے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

آج یہی بٹیا مر رہی تھی۔ زندگی کا سب سے بڑا دکھ ماں کی گود میں اس کے بچے کی موت ہے۔ سعیدہ کا پور پور ماں بن گیا تھا اور نوحہ کر رہا تھا۔ اس کی ایک کم زور اور غریب بیٹی اس کی آنکھوں کے سامنے مر رہی تھی اور کچھ نہ کر پانے کا احساس اسے بری طرح تڑپا رہا تھا۔ اسے گردن جھکائے ، لاتعلق سا، بیڑی بناتا ہوا اپنا شوہر کسی ظالم راکھشس سا لگ رہا تھا۔ کئی بار اس کےجی میں آیا کہ وہ چیخ چیخ کر کمرے کے سناٹے کو توڑ ڈالے اور پتھر کی طرح سخت اور بے حس اپنے شوہر کا سینہ اپنے نکیلے ناخنوں سے چھلنی کر ڈالے۔

جس طرح خاموش کا لے جل والی جھیل کا سناٹا اس میں پتھر گرنے سے ٹوٹتا ہے، اسی طرح اس گرم، اُمس والے کمرے کی خاموشی سعیدہ کی چیخ سے ٹوٹی اور کمرے کا ماحول پانی کی طرح دیر تک کانپتا رہا۔ بٹیا کی آنکھیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں اور بچی کے ساتھ سانس اکھڑنے لگی تو اس کی دادی سمجھ گئی کہ اب اس کا وقت پورا ہو گیا ہے۔ پر ماں کی سمجھ میں یہ تب آیا جب اس نے بیٹا کے منہ کے کونے سے بہتی رال اور الٹی کے گھول کو پونچھنے کی کوشش کی اور اس کے اوپر جھکےجھکے دیکھا کہ بیٹی کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں عجیب طرح سے جھپک رہی ہیں، اور اس کی دونوں آنکھوں کے کچھ اوپر کی طرف چڑھتے چڑھتے اچانک جامد ہو گئے۔ اسے ایک ناقابل برداشت قسم کی گھبراہٹ اور ڈر اپنی پسلیوں میں دوڑتا محسوس ہوا اور وہ چیخ پڑی۔

سعیدہ کے شوہر کے لیے موت ایک بہت معمولی قسم کی چیز تھی۔ اس کے اپنے گھر اور پڑوس میں ہر سال موت کسی نہ کسی کو اپنے جبڑے میں کس لیتی تھی۔ مرنے والوں میں اکثر چھوٹے بچے ہوئے تھے، پر اپنی بچی کی موت میں پتا نہیں کیا تھا کہ ضبط کا سارا ناٹک کرنے کے باوجود سعیدہ کی پہلی چیخ سن کر وہ ہل گیا۔ جس بیٹی کو دو سال میں مشکل سے چار چھ بار گود میں لے کر باپ کی طرح پیار کیا تھا، اس کے مرنے پر وہ کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھا خلا میں تا کتا رہا۔ ماں باپ کی موجودگی اسے رونے سے روک رہی تھی۔ روتی ہوئی سعیدہ زمین پر سر پٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساس اور نند اسے پوری طرح سے جکڑے ہوے تھیں، لیکن پھر بھی بیچ بیچ میں اس کا سر دیوار یا فرش سے ٹکرا جاتا۔ شوہر کا دل ہوا کہ وہ اٹھ کر بیوی کا سر سہلا دے۔ وہ دھیرے سے اٹھا اور پیچھے کے برآمدے میں بیٹھ کر رونے لگا۔ شاید وہ اپنی بیمار بچی کے لیے کچھ نہ کر پانے کا گناہگار تھا جس نے اسے رونے پر مجبور کر دیا۔

۵

لڑکی کی عمر چودہ سال رہی ہو گی۔ نام بتانے سے قارئین کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہونا ہے۔ نام کے ساتھ مذہب جڑا ہوتا ہے اور ہمارے اس مہان جگت گرودیش میں مذہب کبھی انا کی تسکین کی وجہ ہوتا ہے تو کبھی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا بہانہ بن سکتا ہے۔ مثلاً یہ لڑکی اگر مذ ہباً ہند و نکلی تو ہندو دلاوروں کے لیے ڈوب مرنے کی بات ہو جائے گی اور اگر مسلمان نکلی تو اسلام خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ اس لیے اے قارئین، بہتر ہے کہ ہم اس لڑکی کو ہندو یا مسلمان نہ مانیں اور اس کی مصیبت کو صرف اس کی ذاتی مصیبت مان لیں۔

یہ لڑکی اس ملک کی اکثر لڑکیوں کی طرح جہالت، غریبی اور خوابوں کے ساتھ جینے پر مجبورتھی۔ ہندی فلموں اور رانو کے ناولوں نے اس کے جذبات گڑھنے شروع کیے تھے اور وہ دن رات خوابوں میں ان راجکماروں کے بارے میں سوچتی رہتی تھی جنھیں اس کی زندگی میں کبھی نہیں آنا تھا۔ اس لڑکی کی گلی کی نالیوں میں پاخانہ بججا تا رہتا تھا اور صفائی تبھی ہوتی تھی جب کسی بڑے افسر یا وزیر کا معائنہ ہوتا تھا۔ اس لڑکی کی بڑی بہن بھی اس گندی گلی میں لمبی گاڑیوں والے راجکماروں کا تصور کرتی رہی تھی اور پچھلے سال گلی کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ غنیمت یہ ہوا کہ ان لڑکیوں کے باپ اور بھائیوں نے اسے تیسرے ہی دن بمبئی کے ریلوے پلیٹ فارم پر پکڑ لیا اور پندرہ دن کے اندر اسے ایک ایسے خلاصی سے بیاہ دیا گیا جس کی پہلی بیوی اپنے پیچھے تین بچوں کو چھوڑ کر پچھلے ہی سال مری تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ بھی یہی ہونا تھا، پر اس کے باوجود یہ لڑکی عمر کی ماری گنگناتی رہتی تھی۔

روز کی طرح یہ لڑکی آج بھی ایک بجے واپس گھر لوٹ رہی تھی۔ وہ گیارھویں کلاس میں پڑھتی تھی اور اس کا اسکول گھر سے تین کلومیٹر دور تھا۔ صبح سات بجے سے اس کا اسکول شروع ہوتا تھا۔ شفٹوں میں چلنے کی وجہ سے جاڑا گرمی برسات، کبھی بھی یہ وقت بدلتا نہیں تھا۔ گھر سے وہ چھ بجے نکلتی تھی۔ گرمیوں میں تو یہ گوارا تھا، لیکن سردیوں میں اسے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اکثر پہلا پیریڈ چُھوٹ جاتا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ لازمی طور سے پونے چھ بجے نکل جاتی تھی۔ اس پابندی کے پیچھے پڑھائی میں اچانک پیدا ہونے والی دل چسپی نہیں تھی بلکہ وجہ کچھ اور ہی تھی۔

اس لڑکی کی گلی میں کچھ آگے چل کر ایک لڑکا رہتا تھا۔ لڑکا اس سے چار پانچ سال بڑا تھا اور کچھ چھیلا ٹائپ کا تھا۔ سالوں سال ایک ہی گلی میں رہتے ہوے بھی اس سے پہلے دونوں نے ایک دوسرے کو سنجید گی سے نہیں لیا تھا، لیکن پچھلے کچھ دنوں سے ایک دوسرے میں دل چسپی لینی شروع کر دی تھی۔ ہوا یہ کہ اس لڑکے کو انٹر پاس کرنے کے بعد اس کے باپ نے نوکری کرنے کی صلاح دی۔ لڑکے نے بی اے کرنے کی صند کی تو باپ نے دھنُائی کر دی۔ لڑکے نے دو تین دن کھانا پینا چھوڑ دیا۔ باپ نے اسے اپنی تنخواہ اور مہنگائی کا موازنہ سمجھا دیا۔ لڑکا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سات آٹھ دن بعد باپ نے ایک مقامی اخبار میں لڑکے کی تصویر چھپوائی اور نیچے لکھا کہ اس کی ماں سخت بیمار ہے اور وہ فورا لوٹ آئے۔ لڑکا لوٹ آیا۔ باپ نے پھر پٹائی کی۔ لڑکا اس بار نہیں بھاگا اور اس نے چپ چاپ نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اس معاملے میں وہ اپنی پیڑھی کے تمام لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ خوش قسمت نکلا۔ بنا کسی سفارش کے نینی کی ایک فیکٹری میں صرف دو ہزار روپے رشوت دے کر اسے ٹائم کیپر کی نوکری مل گئی۔ رشوت دینے کے لیے اس کے باپ نے دفتر کے کئی لوگوں سے ادھار لیا اور لڑکا اپنی پہلی ہی تنخواہ سے یہ قرض پاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لڑکی کے آج کل پابندی سے صبح پونے چھ بجے گھر سے نکلنے کے پیچھے یہ لڑکا اور اس کی نوکری تھی۔ لڑکے کو آٹھ بجے فیکٹری پہنچنا ہوتا تھا، اس لیے وہ کچھ بجے گھر سے لگتا تھا۔ گھر سے سٹی بس کا اسٹاپ تقریباً ایک کلومیٹر دور تھا۔ یہ وہ راستا تھا جس سے ہو کر لڑکی بھی اسکول جاتی تھی۔ ایک ہی راستے سے جاتے جاتے دونوں کی آنکھیں محاورے کی زبان میں لڑ گئیں۔ صبح صبح بھیڑ کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہوتا تھا؛ اکادکا کوئی بغل سے گزر جاتا۔ آنکھیں لڑانے کے لیے یہ بڑا موزوں وقت ہوتا تھا۔ دو ایک دن تو لڑکی نے دھیان نہیں دیا لیکن ایک دن اچانک اسے لگا کہ اس کے آگے چلنے والا لڑکا جان بوجھ کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چل رہا ہے تا کہ وہ اس کے برا بر آ جائے۔ لڑکی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے رفتار دھیمی کرنی ہے یا تیز ۔ لڑکے کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کا بدن تھر تھرانے لگا اور جاڑے کی اس صبح اس کی کنپٹی گرم ہو گئی۔

لڑکی نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ لڑکے نے بھی اپنی رفتار اور دھیمی کر دی۔ لڑکی سمجھ گئی کہ دوری کم ہونی ہی ہے۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی ، لہٰذا دوری کم ہو گئی۔ پھر تو صبح صبح اٹھنے میں ہو نے والی کابلی ختم ہو گئی اور دو نوں روز پابندی سے ایک کلومیٹر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

اس آدھے گھنٹے ہی کے ساتھ میں دونوں نے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ لڑکی بنا وجہ مسکرانے لگی اور لڑکا اپنے بالوں کو سنوارنے کے لیے اپنی پینٹ کی پچھلی جیب میں کنگھا رکھنے لگا۔ لڑکے کو کل چار سو نوے روپے تنخواہ کی صورت میں ملتے تھے۔ ان میں سے سو روپے کے قریب مہینے میں بس اور رکشا میں خرچ ہو جاتے تھے۔ باقی تین سو نوے روپے وہ لائق بیٹے کے طور پر اپنی ماں کے ہاتھ میں ہر پہلی تاریخ کو دے دیتا تھا۔ نوے سو روپے وہ اپنے جیب خرچ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس دوستی کے نتیجے میں اس نے اپنے جیب خرچ میں کمی کی اور لڑکی کو ایک دن پکچر دکھا لایا، اسے ایک قلم بھینٹ کیا اور دو بار ریستوراں میں چائے پلائی۔ اس مہینے اس نے اپنی ماں کو سو روپے کم دیے اور بہانہ بنا دیا کہ اس کی جیب سے گر گئے۔ وہ لڑکی کو ایک شال بھینٹ کرنا چاہتا تھا۔ اسے دو تین مہینے ماں سے جھوٹ بول کر اتنے پیسے بچانے تھے کہ ان سے شال خریدی جاسکے۔ تب تک سردیاں بھی شروع ہو جائیں گی۔ اس نے اپنا ارادہ لڑکی کو بتا بھی دیا۔ لڑکی کو زندگی میں یہ پہلی شال ملنے جارہی تھی۔ وہ رہ رہ کر شال کا دباؤ اپنے سینے پر محسوس کرتی اور مسکرانے لگتی۔ اس نے اپنے گھر کے دو چار بے کار ہو چکے سویٹروں کو ادھیڑا اور لڑکے کے لیے سویٹر بننے لگی۔ ظاہر ہے کہ وہ ماں کو یہ نہیں بتا سکتی تھی، اس لیے یہ سب کارروائی چوری چھپے ہی ہوئی۔ ایک بڑی سی ٹوکری میں ماں ہر سال جاڑا ختم ہونے پر گھر بھر کے پھٹے چیتھڑے سویٹر سمیٹ کر رکھ دیتی تھی اور جاڑا شروع ہونے سے ایک آدھ مہینے پہلے ان سویٹروں کو اُدھڑ ادھیڑ کی دو تین سویٹروں کا اُون ملا کر، ایک نیا سویٹر بنتی تھی۔ تقریباً ہر سویٹر کا اُون اس عمل سے اتنی بار گزرتا کہ پندرہ بیس دن بننے کے بعد وہ پھر پھٹنے لگتا اور جاڑا ختم ہوتے ہوئے تار تار ہو جاتا۔ اس نے دھیرے سے ایک دن لڑکے کے ناپ کے سویٹر کے لیے ضروری اون ٹوکری میں سے نکال لیا اور اپنی سہیلی کے یہاں رکھ دیا۔ روز اسکول جاتے وقت راستے میں سہیلی کے یہاں سے اون لے لیتی اور پھر دن بھر بن کر واپس آتے وقت سہیلی کے یہاں رکھ دیتی۔

اس لڑکی کی زندگی اسی طرح محرومیوں اور رومانس کا مکسچر بن کر اگلے دو تین سال ، جب تک اس لڑکے کے ساتھ فرار ہونے کا موقع نہیں آتا یا اس کی شادی نہیں ہو جاتی، چلتی رہتی اگر یہ کرفیو اس کے تجربات کی دنیا میں بھونچال بن کر نہ آجاتا۔ ہوا یہ کہ پچھلے ایک ہفتے سے شہر کا مزاج گرم ہو رہا تھا۔ لڑکی کے ماں باپ تجربہ کار تھے اور جانتے تھے کہ مزاج کی یہ گرمی جلد ہی دنگے کی شکل میں برسے گی اور شہر کرفیو کی مار میں آ جائے گا۔ ماں نے رات ہی میں کہہ دیا تھا کہ صبح اسکول نہیں جانا، مگر لڑکی کے روزمرہ میں اسکول کی بہت اہمیت تھی۔ دراصل غریبی کی ماری یہ لڑکی اسکول کے بعد کا پورا وقت اپنے گھر کوسنبھل میں لگاتی تھی ۔ اس کی ماں ایک دکان دار کے لیے پیٹی کوٹ سیتی تھی۔ روز وہ لڑکی کے اسکول سے آتے ہی پیٹی کوٹ سینے بیٹھ جاتی اور آٹھ دس روپے کمالیتی تھی۔ لڑکی اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ گھر کا چوکا بر تن سنبھال لیتی تھی۔ دیر رات تک گھر کے کام کاج کو ختم کرنے کے بعد وہ پڑھنے بیٹھتی۔ پڑھتی کیا، پڑھنے اور سوچنے میں لگی رہتی۔ اس اُو بنے والے اور بے رس ماحول میں سویرے اسکول جانے کی وجہ سے جو تھوڑی بہت مٹناس مل جاتی تھی اسے وہ کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے ماں کے منع کرنے کےباوجود وہ سب کی آنکھیں بچا کر تیار ہوئی اور کب اسکول نکل گئی، گھر میں کوئی نہیں جان پایا۔

لڑکی کو بڑی کوفت ہوئی کہ لڑکا آج نہیں آیا۔ لڑکی کو لگا کہ اسے دیر ہو گئی۔ وہ پوری گلیاں لانگھتی ہوئی سڑک پر اس جگہ تک گئی جہاں لڑکا اپنی کمپنی کی بس پکڑتا تھا۔ وہاں پر روز کے مقابلے میں ایک تہائی لوگ بھی نہیں آئے تھے۔ لگتا تھا شہر کی کیفیت کو دیکھتے ہوے لوگوں نے دفتر نہ جانا ہی مناسب سمجھا۔ بس آئی اور چلی گئی، لڑکی تب تک کھڑی رہی۔ لڑکا بزدل نکلا، اپنی ماں کے آنچل سے نکل نہیں پایا۔ لڑکی نے غصے اور کھیج سے اس کی بزدلی کو کوسا اور واپس گھر جانے کے لیے مڑی ، لیکن گھر جا کر کون ماں کے ہاتھوں ذلیل ہوتا، اس لیے وہ اسکول چلی گئی۔

اسکول میں بہت کم لڑکیاں اور استانیاں آئی تھیں، اس لیے کوئی کلاس نہیں چلی۔ کلاس میں لڑکیاں ادھم مچاتی رہیں اور پر نسپل کے کمرے میں بیٹھی استانیاں بار بار چائے منگاتی اور گپ لڑاتی رہیں۔ لڑکی نے کئی بار سوچا کہ گھر واپس چلی جائے لیکن کھیج اور ماں کے ڈر سے وہ کافی دیر اسکول کے میدان میں دھوپ میں بیٹھی اپنی ایک سہیلی سے دنیا بھر کی باتیں کرتی رہی۔ بات چیت کے اس عمل میں اس نے سنا زیادہ اور بولی کم۔

اچانک انھوں نے دیکھا کہ پر نسپل کے کمرے سے استانیاں بدحواس سی نکلیں اور پھاٹک کی طرف بھا گئیں۔ راستے میں جو بھی لڑکی انھیں ملی ، انھوں نے اسے فورا ًگھر جانے کی ہدایت کی۔ میدان کی طرف ایک چپراسی دوڑتا ہوا آیا اور اس نے دور سے ہاتھ ہلا کر اور چلا کر گھر بھاگ جانے کے لیے کہا۔

ڈھوروں کی طرح ہر طرف سے لڑکیاں بھا گئیں اور زیادہ تر کو گیٹ پر آنے پر پتا چلا کہ شہرمیں گڑ بڑ ہو گئی ہے اور کرفیو لگا دیا گیا ہے۔

حالاں کہ لڑکی کا گھر ایسی گلی میں پڑتا تھا جہاں ہر سال دو سال میں کرفیو لگتا ہی رہتا تھا، پھر بھی کرفیو کے دوران سڑک پر بھاگنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بے تحاشا بھاگی۔ دکانیں دھڑا دھڑ بند ہو رہی تھیں؛ شٹروں کے گرنے کی آواز طلسمی دہشت پیدا کر رہی تھی۔ سائیکلوں پر اور پیدل، بد حواس بھاگتے لوگوں کی بھیڑ، رگڑتی ٹکراتی، گرتی پڑتی، جس طرح دوڑ رہی تھی اس کا تصور بھی کسی دوسرے دن کرنے میں وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتی، مگر آج کی دوڑ سے اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو بھر آرہے تھے۔

جی ٹی روڈ پر تیسری گلی تھی جہاں سے لڑکی اپنے گھر کے لیے مڑتی تھی۔ آج اسے ہوش ہی نہ رہا اور بھیڑ کے ایک ریلے کے ساتھ وہ کسی دوسری گلی میں ڈھکیل دی گئی۔ گلی میں جب وہ گھسی تو ایک جتھے کا حصہ تھی، لیکن کسی طلسم کی طرح اچانک باقی لوگ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے اور اس لڑکی نے دن دوپہر میں اپنے کو ایک ایسی گلی میں پایا جو پوری طرح ویران تھی، جس میں کھلنے والے سارے دروازے اور کھڑکیاں سخت جبڑوں کی طرح بھنچی ہوئی تھیں اور جس کے مکان دولت مند محلوں کی طرح تھے۔ ان مکانوں میں یہی پتا نہیں چل رہا تھا کہ کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ لڑکی گھبراہٹ کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس گلی سے وہ سیکڑوں بار گزری تھی لیکن آج وہ نہ جانے کیسے اجنبی سی لگ رہی تھی۔

وہ ایک کونے میں کھڑی ہو کر زندگی کی علامات ڈھونڈنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر کی کوششوں کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ گلی کے مکان اتنے مردہ نہیں جتنے شروع میں لگے تھے۔ ہر مکان میں کھڑکیوں دروازوں کے پیچھے چہرے سٹے ہوے تھے اور بیچ بیچ میں کوئی پلا کا نپتا اور اس کے پیچھے ڈری گھبرائی آنکھیں جھانکتی نظر آ جاتیں۔ گلی کے باہر جی ٹی روڈ پر کوئی شور ہوتا اور دروازوں کھڑکیوں کی درار میں ایک دم مُند جاتیں۔ آس پاس کے کسی مکان کا دروازہ یاکھڑ کی آواز کرتی اور لڑکی ڈری ہوئی ہر نی کی طرح چوکنی ہو جائی اور اس کی سانس تیز ہو جاتی۔

جن طاقت ور بانہوں نے لڑکی کو بے دردی سے اندر گھیٹ لیا وہ پتا نہیں کہاں سے آگ آئی تھیں۔ لڑکی کو صرف ایک آواز شٹر اٹھانے کی سنائی دی اور جب تک وہ اس آواز کی دھمک سے چونکے، تب تک چھ مردانہ کھردرے ہاتھوں نے اسے ایک تنگ سے چھوٹے کمرے میں گھسیٹ لیا۔ یہ کمرہ ایک چکی کا کمرہ تھا جس میں آٹا پیسا جاتا تھا۔ اس میں چھپے ہوے مردوں نے اچانک شٹر آدھا اوپر اٹھایا اور لڑکی کو اندر گھسیٹ لیا۔ گھسیٹے جانے کی ہڑ بڑاہٹ میں لڑکی کا سر کھٹ سے شٹر سے ٹکرایا۔ سر کی چوٹ اور کھینچے جانے کی دہشت نے لڑکی کو ایک دم وہشت زده کر دیا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن اس کی چیخ حلق میں گھٹ گئی۔ اسے جب تک بات سمجھ میں آتی تب تک دکان کا شٹر پھر سے گر چکا تھا اور وہ ایک ایسی چار پائی پر پٹک دی گئی تھی جو بری طرح جھلنگا ہو چکی تھی اور جس پر آٹے کی پرت در پرت جمی ہوئی تھی۔

میں تمھاری بہن ہوں بھیا، مجھے چلے جانے دو! "

یہی اکیلا جملہ تھا جو وہ لڑکی بول پائی۔ اس پر تینوں دھیرے دھیرے ہنسنے لگے۔ ان میں سے ایک نے بوری کاٹنے کے لیے رکھا ہوا چُھرے کی شکل کالوہا اٹھا لیا اور لڑکی کے سرھانے کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

چپ سالی، ہم بہن ـــہیں!"

لڑکی چپ ہو گئی۔ اس کے بعد جس تجربے سے ہو کر وہ گزری وہ نہایت لجلجا اور خوفناک تھا۔ جتنی دیر وہ ہوش میں رہی اسے ایسا لگتا رہا جیسے گرم سلاخیں اس کے بدن میں چھوٹی جا رہی ہوں ۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اپنے اوپر جھکے ہوے مرد کو دیکھتی رہی اور اپنے تجربوں کی دنیا میں کچھ ایسے تجر بے جوڑتی رہی جو باقی زندگی میں اس کے ساتھ برے خوابوں کی طرح رہنے والے تھے۔

جس طرح ذبح کیے ہوے جانور کے منہ سے غوں غوں کی آواز نکلتی ہے، کچھ کچھ اسی طرح کی آواز لڑکی کے منہ سے نکل رہی تھی۔ درد کی لہر تھی جو پاؤں سے اٹھ کر اس کے پورے بدن کو جھنجھوڑتی چلی جا رہی تھی۔ وہ بری طرح چھٹپٹا رہی تھی اور کئی بار اٹھنے کی کوشش میں چار پائی کی پٹیوں سے ٹکرا کر زخمی ہو چکی تھی۔ اس کی تکلیف تبھی ختم ہوئی جب وہ بے ہوش ہو گئی۔

قارئین ، اس کے بعد کی تفصیل بے کار ہے۔ جس طرح لڑکی کی ذات یا مذہب کے بارے میں پوچھنا بے کار ہے، اسی طرح اس کی عصمت دری کرنے والوں کی ذات یا مذہب جاننے کا بھی کوئی مطلب نہیں۔ اس بات کی بھی تفصیل جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ آٹے کی دھول اور غبار میں اٹی ہوئی لڑکی ہوش میں آنے کے بعد اپنے پھٹے بچے کپڑوں میں گھر کیسے پہنچی، یا پھر اس محلے میں سبھی نامرد بستے تھے جنھوں نے اپنے دروازوں کھڑکیوں کی دراروں میں سے لڑکی کو تین درندوں کے ہاتھوں چکی کے اندر کھینچے جاتے دیکھا اور در اریں چپ چاپ بند کر لیں۔ مطلب صرف اس بات کا ہے کہ کرفیو کسی بھی قوم یا مذہب کی لڑکی کو زندگی کے سب سے معصوم تجربے سے بے دخل کر سکتا ہے اور اسے جانوروں کی سطح پر اتار کر احساس کی ایسی خوفناک سرنگ میں ڈھکیل سکتا ہے جہاں سے ایک بار گزرنے کے بعد پوری زندگی دکھ بھرے خوابوں کی بھول بھلیوں میں تبدیل ہو جائے۔

دنیا میں سب سے بڑی ٹریجڈی ماں کی گود میں اس کے بچے کا مرنا ہے۔ یہ ٹریجڈی اس چھوٹے سے دوزخ نما، ڈیڑھ کمرے کے گھر میں چند گھنٹے پہلے واقع ہوئی۔ اس گھر کے مزدور افراد کے لیے موت ایک دیکھی بھالی صورت حال تھی؛ ہر دوسرے تیسرے سال کوئی نہ کوئی بچہ اس گھر میں یا پڑوس میں مرتا تھا۔ بھوک، غریبی اور جہالت سے جو ماحول یہاں بنتا تھا اس میں بچوں کا زندہ بچ جانا ایک معجزہ تھا۔ لہذا بڑے لوگوں کے لیے تو اس میں بہت کچھ غیر یقینی نہیں تھا، لیکن گھر میں موجود بچے اور سعیدہ اس حادثے سے بری طرح بل گئے تھے۔

کمرے کے بیچوں بیچ دو ڈھائی فٹ لمبی ایک لاش پڑی تھی جسے ایک سفید چادر کے پھٹے ٹکڑے سے ڈھک دیا گیا تھا۔ گھر کے سارے بڑے افراد کمرے کے چاروں طرف دیواروں پر سر لگائے آدھ لیٹے پڑے تھے۔ سعیدہ کی بڑی بچی جو ابھی ابھی ساڑھے تین سال کی ہوئی تھی، ایک ٹک اپنی بہن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہوش میں آج پہلی بار اس کی بہن خاموش پڑی تھی، نہیں تو جب بھی اس نے دیکھا اسے مسمناتے یا روتے ہی دیکھا تھا۔ ایک بار اس نے پوچھا بھی:

کس امی، آج بہنا بولت کا ہے نہیں ؟ "

مگر اس پر سعیدہ اتنی زور سے دہاڑ مار کر روئی کہ وہ گھبرا کر چپ ہو گئی۔ اسے لگا کہ اس نے کوئی ایسی چیز پوچھ لی ہے جو اسے نہیں پوچھنی چاہیے تھی۔ اس کا سات سال کا پھیپھرا بھائی دوسرا ایسا فرد تھا جو اس موت سے بری طرح بے چین تھا۔ دراصل چھوٹی لڑکی ان دونوں بچوں کے لیے کھلونے کی طرح تھی۔ اس کے آنے کے بعد یہ دونوں اپنے کو بڑا سمجھنے لگے تھے۔ سعیدہ اکثر کام دھندے میں پھنسی رہنے پر چھوٹی بیٹی کو ان دونوں کے حوالے کر دیتی تھی۔ حالاں کہ دونوں کو چھوٹی کا لگاتار رونا یا منمنانا ناناپسند تھا، پھر بھی دونوں اس کے ساتھ بڑوں کی طرح پیش آئے؛ اسے تھالی یا کٹوری بجا کر چپ کرانے کی کوشش کرتے یا اپنی گود میں لٹا کر بڑوں کی طرح پانی یا دودھ چمچ یا کٹوری سے پلانے کی کوشش کرتے۔

بچی کی موت دن چھپنے سے تھوڑی دیر پہلے ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے رات اتر آئی اور اس نے اس گھر کو بھی باہر کے پورے ماحول کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ اس گھر میں دویلب تھے؛ ایک اس کمرے میں جہاں گھر کے افراد بیٹھ کر بیڑی بناتے تھے، اور دوسرا پیچھے برآمدے میں جس کی روشنی اس بر آمدے میں ایک کنارے بنی رسوئی اور سنڈاس تک جاتی تھی۔ دونوں کی مریل روشنی نے گھر کے افراد کو جادولوک کی مصور پر چھائیوں سا بنا دیا تھا۔

غم اور ماتم کی رات اتنے دھیرے دھیرے بیتی ہے کہ لگتا ہے وقت تھم گیا ہے۔ ایسی رات کسی بھی طرح کٹتی دکھائی نہیں دیتی۔

کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے  
کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے  
یہ کیسی شب ہجر ہے یا الہی!  
نہ سوتے کٹے نہ روتے کٹےہے

اس گھر کے افراد کے لیے بھی آج کی رات کچھ ایسی ہی ہو گئی ہے۔ گھر کے دو چھوٹے فردموت کے اسرار سے جو جھتے جو جھتے زمین پر لڑھک گئے۔ دوپہر بعد سے ان کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تھا۔ بھوک نے کافی دیر تک انہیں سونے نہیں دیا لیکن نیند تو بچوں کی سب سے پیاری دنیا ہوتی ہے، لہذا خالی پیٹ بھی وہ دھیرے دھیرے نیند کے سمندر میں کھو گئے۔ جانے یہ گھر کی عورتوں کو ماتم کرتے ہوئے دیکھنے کا اثر تھا یا بھوک سے انتڑیوں کی اینٹھن کا نتیجہ، ان کی ننھی آنکھوں سے کالی آنسو بہے تھے اور دونوں کے گالوں پر آنسو لکیروں کی شکل میں جم گئے تھے۔

گھر کے بڑے افراد دیوار پر سر لگائے بیٹھے تھے۔ سعیدہ کا بوڑھا سر اپنی آنکھیں آدھی کھولے، کمرے کی نہ جانے کس چیز پر انہیں لگائے، خاموش، دھیان میں گم سا بیٹھا تھا۔ اپنے بچپن میں ماں باپ کی موت کو چھوڑ کر آج تک کسی کی بھی موت پر وہ مضطرب نہیں ہوا تھا۔ باپ سے وہ بہت زیادہ لگاو محسوس کرتا تھا اور اس کی موت کے وقت تک وہ اتنا سمجھ دار ہو گیا تھا کہ موت کا مطلب اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا۔ اس کا باپ اسے بہت پیار کرتا تھا اور دن بھر بیڑی بنانے کے بعد اسے شام کو گھمانے ضرور لے جاتا تھا۔ اسے سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے یہ سکھ حاصل تھا۔ گھوم کر جب وہ لوٹتا تو اس کے پاس رنگ برنگے کچے اور پتنگیں ہوتی تھیں اور اس کے منھ اور مٹھیوں میں کھٹ مٹھی گولیاں بھری ہوتیں۔ اس کے سارے بہائی چھوٹے سے کمرےمیں بیٹھے بیڑیاں بناتے رہتے اور وہ ان کے حسد کا مرکز بنا، بیچ کمرے میں بیٹھ کر پتنگ میں ڈور چڑھاتا یا کنچے کھیلتا۔ باپ کے مرنے کے بعد اسے جو احساس ہوا وہ بعد کی موتوں پر نہیں ہوا۔ بعد کے برسوں میں موت اس کے لیے معمولی اور ٹھنڈی شے بن گئی۔ جس علاقے میں وہ رہتا تھا وہاں پچیس سال کے بعد ہر شخص تمبا کو اور سیلن کا شکار ہو کر ٹی بی کا مریض بن جاتا تھا۔ بچے بھی بہت زیادہ تعداد میں پیدا ہوتے اور اسی شرح میں مرتے تھے۔ در اصل موت اس کے لیے اتنی جانی پہچانی شے تھی کہ آج بچی کی موت نے اس پر زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔ اسے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ بچی کو دفن کیسے کیا جائے گا۔ آج رات کرفیو کھلنے کے کوئی آثار نہیں نظر آرہے تھے۔ کل دن میں بھی کرفیو کھلے گا یا نہیں، کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ صبح صبح اس کا لڑکا بالٹی لیے جس طرح پانی چھلکا تا ہوا گھر کے اندر آیا اور گھر کا دروازہ بند کر کے ہوا کو گالیاں دیتا رہا، اس سے وہ صاف سمجھ گیا تھا کہ باہر اسے ذلیل کرکے کھدیڑ گیا ہے۔ جس طرح کی سڑی گرمی پڑرہی تھی ، اس میں لاش دو پہر شروع ہونے سے پہلے ہی دفن ہو جانی چاہیے تھی، نہیں تو اس میں سڑاند اور بد بو شروع ہو جاتی۔

کرفیو کا اسے پرانا تجربہ تھا۔ کرفیو کے دوران کو توالی میں بیٹھ کر ایک مجسٹریٹ کرفیو پاس بناتا تھا۔ یہ پاس بنوانا اس کی جیسی حیثیت کے لوگوں کے لیے آسان نہیں تھا۔ پچھلے ایک آدھ موقعوں پر اس نے پاس بنوانے کی کوشش کی تھی اور ہر بار ناکام ہو کر لوٹا تھا۔ لڑکے سے کہنے کے لیے اس نے کئی بار ہمت بٹور نے کی کوشش کی، لیکن ہر بار اس کا منہ دیکھ کر چپ رہ گیا۔

یہ لڑکا اس کی اولاد میں دوسرے نمبر پر تھا، لیکن لڑکوں میں پہلے نمبر کا ہونے کے کارن وہ ذمے داری کے احساس سے وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کے بھیتر بڑا ہونے کا یہ احساس اتناگہر بیٹھا تھا کہ تیرہ چودہ سال کا ہوتے ہوتے وہ بیڑی بنانے کی مشین میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ نہ اس نے دوسرے لڑکوں کی طرح کیرم بورڈ اور شطرنج کھیلنے کے لیے باہر گلی کے چبوتروں پر بھاگنے کی کوشش کی اور نہ ہی پتنگ اڑانے کے لیے دریا کے کنارے دوڑ لگائی۔ اس کے اس غیر معمولی ذمے داری کے احساس نے اس کے چہرے پر سنجیدگی کی ایک ایسی پرت چڑھا رکھی تھی جسے چھید کر اس کے من میں کچھ تھاہ کا پانا نہایت مشکل تھا۔ گھر کا کوئی فرد اس سے ایسی بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا جس کے بارے میں توقع ہوتی کہ اسے پسند نہیں آئے گی۔ آج وہ ب سے چپ کر پیچھے برآمدے میں رو آیا تھا۔ یہ بات بھی گھر کے دوسرے افراد کے لیےتعجب کی تھی۔ جس لڑکی کو اس نے کبھی گود میں اٹھا کر پیار تک نہیں کیا اس کے لیے وہ روئے گا ، یہ کسی کو امید نہیں تھی۔ بہر حال، رونے سے اس کے چہرے کی سختی غائب ہو گئی۔ اس کا چہرہ صاف شفاف نیلے پانی کی طرح ہو گیا تھا جس پر کھنچی دکھ کی لکیر یں صاف نظر آرہی تھیں۔ شاید اس کے چہرے کی یہ نرمی تھی جس سے متاثر ہو کر اس کے باپ نے اس سے کہہ ہی دیا:

" پاس بنوائے ہائے کے ہے۔"

کے جائے ؟ "

"تو اَور کے؟"

" ہم نہ جاب۔"

کا ہے؟"

پھر وہ خاموشی جس سے سب سراسیمہ ہو جائیں۔ مگر اس بار اس خاموشی کی دہشت کو سعیدہ نےتو اور ۔ عام طور سے وہ ساس سسر کے سامنے نہیں بولتی تھی۔ ساس سسر کے سامنے شوہر سے بولنے کی بات تو اور بھی خیالی تھی، لیکن دکھ نے اسے دنیاداری سے پرے کر دیا۔ وہ ابھی تک اسی سوچ سے نہیں ابھری تھی کہ اگر اس کے خاندان کے کسی مرد نے ہمت دکھائی ہوئی اور کرفیو میں جا کر دوا لے آیا ہوتا تو شاید اس کی بیٹیا بچ گئی ہوئی۔ اب اس کے شوہر کی بزدلی کے کارن بیٹی کی مٹی بھی خراب ہو گی۔ دکھ یا غصے میں اکثر وہ کھڑی بولی بولنے لگتی تھی۔ آج تو دونوں کی کیفیت تھی۔ اس نے اونچی آواز میں آہ و زاری شروع کر دی۔ " ہے مولا، میری بٹیا کو زندہ رہتے دوا نہیں ملی، اور اب مرے کے بعد قبرو نہ نصیب ہو گا کا... ہے مولا، کا ہے اس ایسا گن بٹیا کو اس گھر ما بھیجے..."

سعیدہ کے رونے نے سب سے پہلے اس کے سر کو توڑا۔ بوڑھا مذہبی آدمی تھا۔ دونوں وقت کی روٹی کھانے سے فرصت پاتا تو روزہ نماز میں لگ جاتا۔ یہ تصور بھی اس کے لیے محال ہو گیا کہ اس کی پوتی کو مذہبی طریقے سے مٹی نہیں ملے گی۔ اس نے گھر والوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ سبھی تھکے، پست چہرے زمین پر نظریں گڑائے بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چرا کر وہ سعیدہ کے رونے کا مقابلہ کر رہے تھے۔

" کون سکھ ملار ہے مور سون چریا کو ای گھر میں آ کے... نہ ڈھنگ سے دودھ ملا، نہ دوا نہ دارو! اب قبرو نہ ملی... کا مورے آگا!"۔

بوڑھے کو چھٹپٹاہٹ ہونے لگی۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اسے امید تھی کہ اس کی بیوی تو اسے قوت مدافعت دے گی ہی، لیکن اس کی بڑھیا بھی اس سے آنکھیں چرا رہی تھی۔ ایک آدھ بار دونوں کی آنکھیں ٹکرائیں، لیکن ہر بار بڑھیا زمین پر یا خلامیں تاکنے لگی۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھی : سات سے کچھ اوپر کا وقت ہو رہا تھا۔ اس سال پتا نہیں کیا انتظام تھا، لیکن پچھلے کرفیو کے موقعوں کا اسے تجربہ تھا۔ ساڑھے سات بجے کے بعد کوئی کرفیو پاس بنانے والا افسر آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ اگر پاس بنوانا تھا تو فورا ًگھر سے نکلنا تھا۔ وہ کمزور ارادے کے ساتھ تقرباًلڑکھڑاتے ہوے، اٹھا۔ لگاتار بیٹھے رہنے سے اس کا ایک پیر سن ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے مالش کر کے اور چٹکی کاٹ کر اس پیر کو جگایا، کیل پر سے اتار کر کُرتا اپنے بدن پر ڈالا، آہستہ آہستہ ایک بیڑی سلگائی اور جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

گھر سے باہر گلی میں ٹھوس اندھیرا شانت جھیل کی طرح پھیلا ہوا تھا جس میں پہلا پیر رکھتے ہی وہ پوری طرح اس میں ڈوبتا چلا گیا۔ زندگی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ روز اس وقت یہی گلی آوازوں سے بجبجاتی رہتی تھی۔ اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ اس وقت بھجنے والی چارپائیوں کا قطاریں غائب تھیں اور روز جس گلی میں آدھی رات تک بنا کسی سے ٹکرائے نکلنا دو بھر تھا وہ آج کسی چوڑی سڑک کی طرح لگ رہی تھی۔

اس گلی میں عام روشنی پہلے بھی فقط کہنے کو تھی اور آج بھی گھروں کے کواڑ بند ہونے کی وجہ سے ان سے گلی میں پڑنے والی روشنی اور بھی چھن چھن کر پڑرہی تھی۔ ایک طرح سے اندھیرے ہی میں وہ آگے بڑھا، مگر اس کا اسے خوب اندازہ تھا۔ بچپن سے وہ انھیں گلیوں میں پلا بڑھا تھا۔ مکان ضرور اس نے دو تین بدلے تھے لیکن سب اسی علاقے میں تھے۔ گلیاں اندر اندر میلوں پھیلی ہوئی تھیں۔ کوئی اجنبی اگر ان میں پھنس جائے تو اسے باہر کی بڑی سڑک پر نکلنے ہی میں گھنٹوں لگ جائیں، لیکن بوڑھے کی یہ جانی پہچانی دنیا تھی۔ اس میں وہ اندھیرے میں بھی تیرتا چلا جا سکتا تھا۔ مگر آج کی بات کچھ اور ہی تھی۔

آج گلیوں میں خوف پیدا کرنے کی حد تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ جہاں دو تین گلیاں ملتیں یا کوئی گلی سڑک پر نکلتی ، وہیں پولیس کے جوان جتھے بنائے کھڑے یا بیٹھے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ سیٹی بجائے یا کوئی دکھائی دے جاتا تو سٹرک پر ڈنڈے پٹک کر اسے گالیاں دیتے ہوے للکارتے۔ پولیس والوں کے ڈر سے بوڑھے کو کافی لمبا چکر کاٹنا پڑا۔ اس کے گھر سے کو توالی مشکل سے ایک کلومیٹر دور تھی لیکن آج چکر لگاتے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ یہ فاصلہ نہ جانے کتنا بڑھ گیا ہے۔ پولیس والوں سے بچتا بچتاوه کو توالی کے ایک دم پچھواڑے پہنچ گیا تھا کہ اچانک پکڑا گیا۔

ہوا یہ کہ گلی میں سے نکل کر اسے بڑی سڑک پر آنا تھا۔ گلی کے اندر سے سڑک کا جو حصہ دکھائی دے رہا تھا وہ بالکل خالی تھا۔ کوئی آواز بھی نہیں تھی۔ لیکن سڑک پر آ کر جیسے ہی وہ تین چار قدم آگے بڑھا، گالیوں کی بوچھار اس کے کانوں میں پڑھی۔ اس کے بوڑھے جسم نے بھاگنے کی مضحکہ خیز حرکت کی، مگر ایک ڈنڈا اس کے پیروں پر پڑا اور وہ گر پڑا۔ گرنے پر اس نے احساس کیا کہ غلطی کہاں پر ہوئی۔ گلی جہاں کھلتی تھی وہیں ایک دکان کی پنچ پر کچھ سپاہی ایک کھمبے کی آڑ میں بیٹھے ہوے تھے۔ تھکے، اکتائے ہوے، وہ اونگھ رہے تھے اس لیے خاموش تھے۔ بوڑھے کو دیکھ کر وہ ہوشیار ہو گئے اور ان میں طراری آ گئی۔

پتا نہیں بڑھاپا تھا یا دہشت، بوڑھا گرا تو پھر دیر تک نہیں اٹھا۔ پسینے اور رال نے اس کی داڑھی بھگو دی اور اس کی مغموم ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں سپاہیوں پر ٹکی اگلے ڈنڈے کا انتظار کر رہی تھیں، لیکن اگلا ڈنڈا نہیں اٹھا۔ اس کے بڑھاپے نے سپاہیوں کو بے دل کر دیا۔ جس سپاہی نے ڈنڈا مارا تھا وہی گالیاں بکتا رہا، باقی سب ادب سے بھرے بیٹھے رہے۔

مادر، اس کرفیو میں نکلنے کو کیا ڈا کٹر بتائے رہے ؟

بوڑھا چپ رہا۔ کچھ بولنے کو اس کے ہونٹ کا نپے لیکن حلق سے غوں غوں کے سوا کوئی صدا نہیں نکلی۔

" بول سالے، کوئی ہم دم تو نہیں چھپائے ہے؟ مُسلوں کا کوئی بھروسا نہیں ! دیوان جی، تلاشی لے لوں کیا ؟"

لے لو۔ لیکن پوچھ تو لوکہاں جا رہا تھا۔"

" بول ہے !کہاں جا رہا تھا ؟ "

بوڑھے نے بولنے کی کوشش کی مگر اب بھی اس کی آواز سمجھ میں آنے لائق صاف نہیں ہوئی تھی۔ سپاہی نے اس کا کالر پکڑ کر اسے اٹھا لیا۔ بوڑھے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ملتجیانہ کچھ کھنے کی کوشش کی، مگر گھبراہٹ اور ڈر سے نکلی آواز سپاہیوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔

بہن ، بولتا ہے یا دوں ایک رپٹا اَور ؟ " سپاہی نے ہاتھ اٹھا یا۔ جڑے ہوے دونوں ہاتھ بوڑھے نے اپنے منھ کے سامنے کر لیے۔ سپاہی نے بھی مارا نہیں ، صرف دھمکاتا رہا۔ تھوڑی دیر میں بوڑھے کے بول صاف پھوٹے :

سر کار، پاس بنوائے جارہا۔ گھر میں مٹی پڑی ہے۔ نائن گزر گئی۔"

"کیا ؟ سپاہی تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔ "

جھوٹ تو نہیں بول رہا ؟ ابھی گھر چل کر دیکھیں گے۔ اگر غلط نکلا تو سا لے، ڈنڈا ڈال دیں گے! دوسرے سپاہی نے کہا۔

"چلو دیکھ او صاحب، پاس ما گھر ہے۔"

اس پولیس ٹکڑی کا نایک سنجیدہ آدمی تھا۔ وہ ابھی تک زیادہ نہیں بولا تھا مگر بات لمبی کھنچتے دیکھ کر اس نے دخل دیا:

جانے دو بھیا، غمی کسی پر بھی پڑسکتی ہے۔“

کٹووں کو بچے پیدا کرنے کے سوا اور کیا کام ہے! سالے چوہے کے بچوں کی طرح پیدا کریں گے اور مریں گے۔ چھوڑو سالے کو۔ بھاگ جا بے ! بنا پاس لیے لوٹا تو سمجھ لے تیرے باپ یہاں بیٹھے ہیں۔ بھاگ... بھاگ جا ! "

بوڑھا بھاگنے کی حالت میں نہیں تھا، لیکن لڑکھڑاتے قدموں سے جس رفتار سے وہ چلا وہ اس کی عمر کے لحاظ سے بھاگنے جیسی ہی تھی۔ وہ ایک آدھ بار لڑکھڑایا، گرتے گرتے سنبل، اور گرتا سنبھلتا آخر میں کو توالی کے موڑ پر پہنچ گیا۔

کو توالی میں پچھلے برسوں جیسا ہی منظر تھا۔ باہر سڑک پر پولیس ، پی اے سی اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں پٹی پڑی تھیں۔ پولیس کے جوان بے ترتیب سڑک پر، بند پڑی دکانوں کے چبوتروں ، بنچوں اور بھٹیوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ بیچ میں کسی بڑے افسر کے آنے پر ان میں ہلچل ہوتی لیکن پھر جلد ہی وہ تھکان اور ادب کے مہاساگر میں ڈوب جاتے۔ ایک کنارے پر بیٹھی ایک لیڈی مجسٹریٹ

کرفیو پاس بنا رہی تھی۔ اس کا کمرہ اور کمرے کے باہر کا برآمدہ مچھلی بازار کی طرح شور سے بھنبھنا رہا تھا۔ کمرے کے باہر اندر دلالوں، نیتاؤں، صحافیوں، خدائی خدمت گاروں، اور مصیبت زدہ لوگوں کا جمگھٹا تھا۔ پریشان حال لوگ ایک ایک پاس کے لیے گڑ گڑا رہے تھے۔ نیتا اور وقال دھڑادھڑ پاس بنوا کر اپنے اپنے چمچوں کو دیتے جا رہے تھے۔ جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا، جھڑکیاں کھاتے ہوئے ایسے لوگوں کی بھیڑ میں بوڑھا بھی شامل ہو گیا۔

بوڑھا اس ملک ایسے کثیر لو گوں کے گروہ کا حصہ تھا جس کے لیے عزت اور ذلت کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ بے کسی ان کے وجود کا اٹوٹ حصہ بن جاتی ہے۔ زندگی بھر دھتکارے جاتے، ڈانٹیں کھاتے، ان کا پورا قد انسانی قد سے کافی چھوٹا ہو جاتا ہے۔ بوڑھا بھی بار بار بھیڑ میں ہچکولے کھاتا ، لتاڑا جاتا، دائیں بائیں ہوتا رہا اور آخر میں مجسٹریٹ کی میز تک پہنچ ہی گیا۔

نام ؟ نام بولو، جلدی ! اب کیا ایک گھنٹے تک میں تم سے نام ہی پوچھتی رہوں گی ؟“ مجسٹریٹ کی جھنجھلائی ہوئی آواز نے بوڑھے کو جھنجھوڑا۔

"عبدالرشید... عبدالرشید.

وجہ ؟"

"جی"

" جی جی کیا کر رہا ہے ؟ پاس لینے کی وجہ کیا ہے ؟"

پوتی مر گئی ہے۔ کل مٹی دینی ہے ۔

" اوہ... کیا عمر تھی اس کی ؟ آواز پہلی بار نرم ہوئی۔

بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مری ہوئی پوتی کی عمر یاد کرنے کی اسے ذرا بھی خواہش نہیں ہوئی۔

کتنے لوگ جائیں گے ؟"

سات آٹھ۔"

سات آٹھ کیوں ؟ دو بہت ہیں۔ آواز پھر چڑچڑاہٹ اور کھسیاہٹ سے بھر اٹھی۔ بوڑھے نے ایسے موقعے پر وہی کیا جو اس دنیا کے لوگ کرتے ہیں۔ پہلے اس نے بحث کرنے کی ناکام کوشش کی، پھر ڈانٹ دیے جانے پر وہ ادھورے لفظوں میں گڑ گڑانے لگا۔ کوئی اثر نہ پڑتا دیکھ کر اس نے مجسٹریٹ کے پیر پکڑنے کی کوشش کی۔ آخر میں جھڑکی کے ساتھ وہ تین لوگوں کے لیے کل صبح کا کرفیو پاس مٹھی میں بھینچے کمرے سے باہر نکل گیا۔

راستے بھر اسے دو تین جگہ ٹوکا گیا۔ دو تین جگہ اسے پولیس والے ہی ملے، لیکن کرفیو پاس نے اس کے دل میں ایک خاص طرح کی خوداعتمادی بھر دی تھی۔ ایک آدھ بار جب پولیس والوں نے کرفیو پاس الٹ پلٹ کر دیکھا، اسے پھاڑ کر پھینکنے کی دھمکی دی یا سچ مچ ہی ہوا میں اچھال کر زمین پر پھینک دیا، تو اس کی خوداعتمادی ڈگمگائی ضرور ، لیکن پھر بھی اس کی بے کسی اور خوداعتمادی نے مل کر ایسی فضا پیدا کر دی کہ وہ دھیرے دھیرے کسی طرح گھر پہنچ ہی گیا۔

گھر پوکھر کے شہرے ہوے پانی کی طرح تھا۔ اس میں اس کے آنے سے ہلکی ہلکی ہلچل شروع ہو گئی۔ سبھی بڑے لوگ جاگ کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک بار بلکلے سے کھٹکھٹانے ہی پر بڑھیا نے دروازہ کھول دیا۔ ایسا لگا جیسے وہ اس کا دروازے سے لگ کر انتظار کر رہی تھی۔ اسے غصہ بھی آیا کہ بنا نام وام پوچھے بڑھیا نے کیسے دروازہ کھول دیا ، لیکن وہ ضبط کر گیا۔

پاس ملا ؟ " بڑھیا نے اس کے گھر میں گھستے ہی پوچھا۔

ہاں ملا۔ تین جنے جائیں گے۔ صبح مولوی صاحب کا دیکھنے کا پڑی۔ "

پس تین جنے؟ کیسے کل ہوئی ؟"

ساس کی آواز سن کر سعیدہ کچھ چونکی۔ وہ گھٹنوں میں منھ دبا کر بیٹھی تھی۔ اسے لگا کہ شاید اس کا سسر ناکام لوٹا ہے۔ اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ "

ہے مولا، ہمری بٹیا کے کا مائی بھی نہ ملی..."

"چوپ... سالی... خوب ملی ماٹی۔ من بھر کے ماٹی دے کل ! " اس کے شوہر نے اسے بیچ ہی میں ڈپٹا۔ پوری واردات میں اپنی بیوی کے سامنے بزدل ثابت ہو جانے کے احساس نے اسے درندگی کی حد تک وحشی بنا دیا تھا۔ وہ اتنا خاموش طبیعت کا انسان تھا کہ اس نے شاید ہی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ گالی گلوچ کی ہو۔ آج پتا نہیں بیوی کی نظر میں ڈرپوک ثابت ہو جانے کی شرم تھی یا اپنی مرقی ہوئی بیٹی کے لیے کچھ نہ کر پانے کی بے بسی، جس نے اسے وحشی بنا دیا۔ اگر سعیدہ فوراً پوری بات سمجھ کر چپ نہ ہو جاتی تو شاید وہ اسے مار بھی بیٹھتا۔

بوڑھے کے آنے کے بعد خاموش کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے آوازوں کی جو ہلچل ہوئی تھی ، وہ جلد ہی دھیرے دھیرے پھر خاموش ہو گئی۔ کمرے کے افراد جنھوں نے کھڑے ہونے یا بیٹھنے کے لیے اپنے پہلو بدلے تھے، پھر سے دیواروں پر پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گئے۔ صرف سعیدہ کی ساس اٹھ کر کے الٹ پلٹ رہی تھی۔ کافی محنت کے بعد اسے ایک سفید چادر مل ہی گئی۔ وقت کی مار نے اسے بدر کا بنا دیا تھامگر سعیدہ کی ساس کو لگا کہ اس کے سوا کفن کا کام دینے کے لیے اس کے پاس کوئی اور کپڑا اس وقت نہیں مل سکتا۔ وہ اسی کپڑے کو لے کر قینچی سے کاٹ چھانٹ کرنےلگی۔

رات کو تو بہر حال بیتنا ہی تھالیکن جاگتی آنکھوں سے یہ قرض کی صورت میں ادا ہو رہا تھا۔ بچی کی لاش کے ارد گرد چھوٹے بچے فرش پر لڑھک گئے تھے۔ اگر لاش کا منہ کپڑے سے ڈھکا نہ ہوتا تو یہ بھی ان نیند میں ڈوبے بچوں میں سے ایک ہوتی۔ بڑوں کے پیٹ میں صبح کے بعد پانی کے سوا کچھ نہیں گیا تھا۔ پانی بھی کفایت کے ساتھ خرچ ہوا تھا، اس لیے سب کی آنتیں بھوک سے اینٹھی ہوئی تھیں اور سبھی کے حلق پیاس سے سوکھے تھے۔ یہ روز کمانے اور روز کھانے والوں کا گھر تھا۔ کرفیو لگنے کے دوسرے یا تیسرے دن سے فاقوں کی نوبت آ جاتی تھی۔ اگر موت نہ ہوئی ہوئی تب بھی شاید یہی حالت ہوتی۔ وہ سبھی آدھ لیٹے کل کی فکر میں تھے۔ اگر کل بھی کرفیو نہیں ہٹا تو دوسرے وقت تک تو گھر کے بچوں کو بھی فاقہ کرنے کی نوبت آجانے والی تھی۔

ٹمٹماتے بلب کی روشنی میں رات بیتی لیکن بہت دھیمے دھیمے۔ باہر گلی میں دو ایک بار پولیس والوں کے بوٹوں کی آہٹ گونجی۔ ایک آدھ بار دو کہیں ہر ہر مہادیو یا اللہ اکبر جیسی آواز سنائی دی۔ کمرے کے لوگ ایک دوسرے سے آنکھیں چرائے، بہت آہستہ آہستہ حرکت کرتے رہے اور رات ہولے ہولے بیتتی رہی۔

۷

سری گرمی کی دوپہری میں تین بجے بجلی چلی گئی اور جلد ہی سفید پوشوں کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ ایک کمرے میں ایک خاتون مجسٹریٹ بیٹھ کر پاس بنا رہی تھی۔ اس کے کمرے میں اتنی آوازیں بھنبنارہی تھیں کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر پلے ہوے تھے اور ایک کے اوپر ایک گرے پڑ رہے تھے۔ ایسے میں بجلی چلی گئی اور پنکھا بند ہوا تو پسینے اور جھنجھلاہٹ نے کمرے کو چھوٹے موٹے لڑائی کے میدان میں تبدیل کر دیا۔

پنکھا بند ہوتے ہی بغل کے بڑے کمرے میں بیٹھے صحافیوں نے فساد کا تذکرہ چھوڑ کر بجلی کے محکمے کو کوسنا شروع کر دیا۔ انھیں تین بے ضلعے کے اعلیٰ حکام نے مختصر معلومات دینے کےلیے بلایا تھا۔ ایک تو ساڑھے تین بج چکے تھے اور اعلیٰ حکام ابھی تک غیر حاضر تھے، دوسرے بجلی چلی گئی۔ صحافیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ جو چھوٹے افسران ابھی تک بیٹھے انھیں بہلا ر ہے تھے، دھیرے دھیرے باہر کھسک گئے۔ صحافیوں نے پریس کانفر نس کے بائیکاٹ کی بات کی اور بنا کسی بے صبری کے بیٹھے رہے۔ آج ان کا اپنا مطلب تھا اس لیے چاہے جتنی بھی دیر ہو وہ اٹھنے والے نہیں تھے۔ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو ان میں زیادہ تر پیر پٹکتے ہوے نکل جاتے اور چھوٹے افسران ان کے سامنے گھگھیاتے رہ جاتے۔

تیسری طرف کو توالی کے آنگن میں ایسے لوگوں کی بھیڑ تھی جنھیں امن کمیٹی کی بیٹھک کے لیے بلایا گیا تھا۔ یہ سیاست داں ، سوشل ور کر، بیوپاری اور ڈاکٹر وکیل جیسے پیشوں سے وابستہ لوگ تھے جو ہر سال فساد کے موقعے پر یا تہوار وغیرہ کے دنوں میں کو توالی میں بلوائے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے چہرے اور تقریریں اتنی گھسں پٹ گئی تھیں کہ کو توالی کی دیواریں بول سکتی ہوتیں توان کے کھڑے ہوتے ہی ان کی تقریر دہرانے لگتیں۔ اس سال بھی فساد شروع ہونے پر پہلے تو افسروں نے حکم جاری کیا کہ ایک پرندہ بھی سڑکوں پر نہ دکھائی دے اور باہر نکلنے والوں کی کھال کھینچ لی جائے۔ بعد میں جب منتریوں کے دورے شروع ہوے اور یہ شکایت کی جانے لگی کہ عوامی نمائندوں کا اشتراک نہیں لیا جا رہا ہے، تب انھوں نے رات دیر گئے امن کمیٹی کا اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا۔ صبح سے دوپہر تک جلدی جلدی لو گوں کو اطلاع دینے کے لیے سپاہی دوڑائے گئے اور تین بچے کے اجلاس کے لیے ساڑھے تین بجے تک دس پندرہ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اکا دکا لوگ ابھی تک آتے جا رہے تھے، اور آنے کے بعد قریب قریب سبھی لوگ یہی قصہ سناتے کہ کس طرح انہیں دیر سے خبر ملی اور کس طرح انھوں نے فوراً بدن پر کرتا ڈالا یا چپلیں پہنیں اور بھاگے چلے آئے۔ اس طرح کا اجلاس کبھی وقت پر نہیں شروع ہوا تھا، اس لیے امید تھی کہ اگلے ایک آدھ گھنٹے تک لوگ آتے رہیں گے۔ حکام نے سوچا بھی یہی تھا کہ پر یس کا نفر نس کے بعد یہ اجلاس شروع ہو جائے۔

بجلی کے جاتے ہی تینوں جتھوں میں بٹے ہوے لوگ ایک دوسرے میں گنڈ ہونے لگے۔

اُمس اور پسینے سے تر لوگوں کے لیے بیٹھنا مشکل ہونے لگا۔ پریس کے لوگ اٹھے اور باہر برآمدے میں دو تین گروپوں میں بٹ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی بات چیت کا خاص موضوع فساد کی شروعات کی وجہ اور فساد میں افسروں کی ناکامی تھا۔

منشی سر پرشاد پرانے جنگ آزادی کے سپاہی تھے اور پچھلے بیسں برسوں سے راجد ھافی سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامے کے نمائندہ خصوصی تھے۔ وہ ستر سال کی عمر میں بھی بالکل چاق و چوبند رہتے تھے۔ لوگ انھیں چھیڑتے تھے اور وہ ہر بار کوئی ایسا بے باک تلخ تبصرہ کر دیتے تھے جس سے کوئی نہ کوئی تلملا جاتا اور دوسرے لوگوں کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا۔ آج وہ خاموش بیٹھے تھے اور کئی صحافیوں کی کوششوں کے باوجود کچھ نہیں بولے۔

کیا بات ہے منشی جی، آج طبیعت کچھ ڈھیلی لگ رہی ہے ۔ “

"طبیعت سسری کو کیا ہوا ہے، پر... منشی جی نے بہت ٹالنے کی کوشش کی لیکن پھر انھیں محسوس ہوا کہ نہ بولنے پر چھیڑ خانی ہو گی، اس لیے بولے، "میں سوچ رہا تھا یہ امن کمیٹی کے نام پر جو شنکرجی کی برات کو توالی میں اکٹھی کی گئی ہے، اگر ان سب کو بند کر دیا جائے تو شہر میں دنگا فساد ا بھی رک جائے۔ " تیز ہنسی کا فوارہ چُھوٹا۔ امن کمیٹی میں حصہ لینے والے جو بر آمدے میں کھڑے تھے، ان میں سے کچھ نے نہ سننے کا ناٹک کیا اور کچھ تلملا گئے۔ کچھ، جو زیادہ موٹی چپڑی کے تھے، انھوں نے ہنسی میں ساتھ دیا۔

انھیں کوکا ہے کو بند کرتے ہیں منشی جی ! ارے اپنے صحافی ساتھیوں کی بات کیجیے نا، جو چٹخارے لے لے کر خبریں چھاپ رہے ہیں۔ مرے گا ایک ، انہیں لاشیں پچیس دکھائی دیں گی۔ پٹانا چھوٹے گا تو بم چاپیں گے۔ ہمارے ساتھ ساتھ انھیں بھی بند کیجیے تبھی فسادر کے گا۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر ہنگامہ ہوتا رہا۔ پریس کی آزادی سے لے کر حکومت میں عوام کی حصے داری تک تمام باتیں ہوتی رہیں، لیکن جلد ہی معاملہ ٹھنڈا ہو گیا اور دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے سے انفرادی ہنسی مذاق کرنے لگے۔ زیادہ تر لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرنے کے عادی تھے۔

منشی جی کا من پھر سے گھن ہو گیا۔ وہ فساد زدہ علاقوں میں آج دیر تک گھومتے رہے تھے اور تشدد کی تباہی کے ننگے ناچ سے بری طرح بے چین تھے۔ صحافیوں اور امن کمیٹی کے لوگوں کے درمیان جو فحش قسم کے مذاق اندر چل رہے تھے، انھوں نے انھیں اور غم زدہ کردیا۔ راجدھانی سے چار اخبارونویسوں کا ایک گروہ آیا تھا جو اپنی پوشاک اور کیمروں کی وجہ سے الگ پہچانا جا رہا تھا ۔ اپنے کو مقامی صحافیوں سے زیادہ معززمانتے ہوے ، یہ گرالگ کھڑا تھا۔ منشی جی بجھے دل سے اس گروہ کے پاس چلے گئے۔

منشی جی، اِٹ ازہاریبل! بڑی ٹریجدی اس شہر میں رونما ہو چکی ہے، پھر بھی ان جرنلسٹوں کے احساسِ خودداری کو کیا ہوگیا ہے؟ کیسے بے شرم ہوکر ہنس رہے ہیں ۔"

منشی ہرپرشاد نے آنکھیں سیکڑ کر جینزدھاری لڑکی کو بولتے ہوے سنا۔ انھیں لگا کہ انھیں قے ہوجائے گی۔ آج یہ لڑکے لڑکیاں ان کے ساتھ گھومتے رہے تھے ۔ جلے ہوئے مکان یا ان کے ملبے میں دبے کنگالوں کو دیکھ کر انگریزی میں اپنی تکلیف بیان کرنے والے ان لوگوں نے تیز دھوپ ہوجانے پر انفارمیشن افسر کی جیپ سے کریٹ اتروا کر ای کآدھ جلے مکان کے برآمدے میں بیٹھ کر چِلڈ بیئر پی تھی۔ منشی جی ڈرائیور کی بغل میں بیٹھے غصے سے ہارن بجاتے رہے تھے۔ اب اس لڑکی کو دوسرے بے شرم اور بے حس لگ رہے تھے۔

کامریڈ سورج بھان منشی جی کی دلی حالت بھائپ گئے ۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے ان کی دوست تھے۔ یہ بات انھیں اچھی طرح معلوم تھی کہ منشی ہر پرشاد صرف قلم گھسیٹ صحافی نہیں تھے؛ خبریں انھیں متاثر کرتی تھیں اور اکثر خبریں جمع کرتے وہ ان کا حصہ بن جاتے تھے۔ انھوں نے قریب جا کر ملائمت سے منشی جی کا ہاتھ پکڑ ا اور انھیں ایک دوسرے کونے کی طرف لے گئے ۔

برآمدے کے ایک طرف زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے پر لوگوں کا دھیان اُدھر منتقل ہوگیا۔ کھبیم چند جگل مشورنامی فرم کے مالک لالہ رادھے لال چِڑاتے جانے پر کسی زخمی ناگ کی طرح چھنکار رہے تھے۔

ٹھیک ہے فساد میں اناج کی قیمتیں بڑھیں گی تو میرا فائدہ ہوجائے گا ، لیکن فائدہ کاٹنا ہے؟ میں اتنا گنہگار نہیں ہوں کہ اپنی بِکری بڑھانے کے لیے خود فساد کرادوں۔آپ تو شرماجی ، یہ بھی کراسکتے ہیں۔ آپ کو پاکستان اور مسلم لیگ کے جھنڈے میں فرق نہیں معلوم ہے۔خلد آباد کی مسجد کی بغل میں مسلم لیکگ کا دفتر ہے۔ پھر بھی آپ نے مسلم لیگ کے دفتر پر لہر انے والے جھنڈے کی تصویر چھاپ کر یہ کیپشن دیا کہ مسجد پر پاکستانی جھنڈا لہرایا گیا ہے۔ اب بتائیے، فساد آپ کرار ہے ہیں کہ ہم ؟"

لیکن گرو! فساد شروع ہونے پر منافع تو تم ہی کماؤ گے۔"

ہاں ، اب جنتا سالی گدھی ہے، دنگا کرتی ہے، تو چار پیسے کم بھی کما لیتے ہیں۔"

لوگ ہنسےاور پھر ذاتی قسم کے مذاق ہونے لگے جس سے فضا کا بوجھل پن گھٹنے لگا۔

ان دونوں طرح کی بھیڑسے الگ تیسری قسم کی بھیڑ تھی جو بجلی چلی جانے کے باوجود کمرے سے نکلنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہ کرفیو پاس بنوانے والوں کی تھی جو ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک خاتون مجسٹریٹ اور دو تین اہلکاروں سے اُلجھی ہوئی تھی۔ مجسٹریٹ ایک نوجوان لڑکی تھی جو ابھی نئی نئی نوکری میں آئی تھی۔ نئی ہونے کی وجہ سے ابھی وہ اپنے دوسرے ہم پیشہ افسروں کی طرح بے حس نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تک اس کے دل میں کچھ آدرش واد باقی تھا۔ وہ کچھ کام کرنا چاہتی تھی اور جنتا اس کے لیے پوری طرح سے فضول چیز نہیں ہوئی تھی ، اس لیے پسینے سے بالکل لت پت ہونے پر بھی وہ اپنے کام میں بٹی ہوئی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ جھنجھلا ضرور جاتی تھی لیکن اس کی انگلیاں رک نہیں رہی تھیں۔ اس کے عملے نے دو ایک بار گرمی یا امس کی دہائی دی لیکن مجسٹریٹ کی بے رُخی کی وجہ سے انھیں باہر جانے کا موقع نہیں ملا۔

امن کمیٹی میں آئے ہوے لوگوں میں کچھ سیاسی لیڈر تھے۔ میونسپلٹی کے چناو قریب تھے۔ باہر آنے پر انھیں پاس بنوانے والوں میں اپنے ووٹر نظر آگئے۔ انھوں نے اپنے اپنے ووٹروں کو پکڑا اور ان کے پاس بنوانے کے لیے چل پڑے۔ ان کے آجانے سے سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ مجسٹریٹ کی آواز زیادہ جھنجھلا نے لگی۔ ایک دوسرے کو ڈھکیلتے اور شور مچاتے لیڈروں کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ کمرے میں اُمس زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس نے اچانک اپنی فائلیں بند کیں اور اعلان کیا کہ بجلی آنے پر کام ہو گا۔ اس کے ماتحتوں کو موقع ملا، وہ سر پٹ کمرے ۔ سے نکل بھا گے۔ مجسٹریٹ کے عورت ہونے کے خیال سے لیڈر لوگ پہلے تو سٹپٹائے، پھر ایک دم سے ہلا شروع ہوگیا۔

"افسر شاہی نے دیش برباد کر دیا صاحب! پہلے دنگا کراتے ہیں، پھر جنتا کے ساتھ جانوروں کی طرح پیش آتے ہیں۔"

"اجی دنگا ہو تو ان کی انکم تو اور بڑھ جاتی ہے۔ بانٹیے رلیف، کمائیے پیسا! ہمیں نہیں پتا یہ کل سے جو دودھ بٹ رہا ہے اس کی ملائی کہاں جارہی ہے!"

ارے یہیں دیجے سور و پیا ایک پاس کا، سب بن جائے گا۔ بجلی رہے نہ رہے!"

"کیا... کیا کہا؟ میں پیسا مانگ رہی ہوں ؟ '' مجسٹریٹ کا منہ تمتما گیا۔ وہ کچھ اور کھنا چاہتی تھی پر اس کی آواز رُندھ گئی۔ اس کے چپراسی اور ماتحتوں نے دو ایک پولیس سپاہی بلا لیے اور ان کی مدد سے اسے بغل والے کمرے میں لے گئے۔

مجسٹریٹ نئی تھی اور اس لیے اس طرح کی کیفیت جھیلنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ لیڈر لوگ پرانے تھے، انہیں پتا تھا کہ بھیڑ بن کر کس طرح افسروں کو ہُوٹ کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں پریشان اور دکھی لوگوں کا جتھا تھا جنھیں پتا نہیں چل پا رہا تھا کہ انھیں کرفیو پاس کب ملے گا۔ ان میں سے کسی کا بچہ بیمار تھا، کسی کو اسٹیشن جانا تھا۔ یہ لوگ کمرے میں ادھر ادھر بکھر کر بیٹھ گئے۔ انتظار کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

ایکسکیوز می ، منشی جی ، یہ جھنڈے کا کیا معاملہ ہے ؟ دلی سے آئے ہوے پر یس کے لڑکے لڑکیوں نے منشی جی کو گھیر لیا۔

جھنڈا ؟ کیسا جھنڈا ؟ " منشی جی نے ٹالنے کی کوشش کی۔

ا بھی کوئی کہ رہا تھا نا کہ یہاں لوکل پریس نے مسلم لیگ کے جھنڈے کو پاکستانی جھنڈا بناکر چاپ دیا تھا ؟ "

منشی جی مقامی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے، اس لیے جواب دیا سورج بھان نے:

” بھائی، معاف کیجیے گا آپ کا نام نہیں معلوم، لیکن آپ جو بھی ہوں اتنا سن لیجیے کہ آپ کے راجدھانی کے اخباروں نے بھی کم غدر نہیں ڈھایا ہے۔ ہر دنگے میں آپ لوگ پاکستانی ہاتھ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ آزادی کے بعد سے کوئی دنگا ایسا نہیں ہوا جس میں مسلمان زیادہ نہ مارے گئے ہوں، لیکن آپ لوگ ہمیشہ ایسی خبریں چاہتے ہیں جن سے لگتا ہے کہ ہندوؤں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ اگر مسلمان پی اے سی کی زیادتی کی شکایت کرتے ہیں تو وہ آپ کو غدار نظر آنے لگتے ہیں۔ لو کل پریس والے آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مسجد کی بغل میں مسلم لیگ کے دفتر پر اس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ تھوڑی سی ٹرک فوٹو گرافی سے جھنڈا مسجد پر پہنچ گیا۔ نیچے یہ کیپشن دینے میں ان کا کیا جاتا ہے کہ جھنڈا پاکستانی ہے۔ اب اس بات سے اگر شہر کا تناؤ کچھ بڑھ گیا تو اخبار والوں کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ دلی سے لکھنؤ تک اخباروں کے دفتروں میں زیادہ تر پینٹ کے نیچے ہاف پینٹ پہننے والے لوگ ہیں۔

" منشی ہر پرشاد نے کامریڈ سورج بھان کا ہاتھ دبایا اور انھیں ایک کونے میں لے گئے۔ راجدھانی والے ان کے حملے سے کچھ بوکھلا گئے۔ وہ جواب دینا چاہتے تھے لیکن کامریڈ کے ہٹ جانے سے تلملا کر رہ گئے۔

بجلی اور اعلیٰ حکام ایک ساتھ آئے۔ ایک کمرے میں پر یس کا نفر نس شروع ہوئی۔

مرنے والوں کا ٹوٹل کتنا پہنچا ؟ "

"سترہ۔"

نہر میں کتنے بہا دیے گئے ؟"

مرنے والوں کی گنتی کیسے کرتے ہیں ؟ "

"مردہ خانے میں پوسٹ مارٹم کے لیے جتنی لاشیں پہنچی ہیں ....

"پر جو پہنچ ہی نہیں پائیں، جنھیں نہر میں بہا دیا گیا، ان کا .."

ٹھنڈے کی بوتلیں، برفی اور سموسے آ گئے۔ بیچ بیچ میں شکوے شکایتیں ہوتی رہیں کہ پریس کو کرفیو پاس دینے میں دیر کی گئی، کرفیو زدہ علاقے کے دورے کے لیے محکمہ اطلاعات کو دھکامار جیپ مہیا کرائی گئی، اسے بھی دلی پر یس لے کر گھومتا رہا، لوکل پریس والے ٹاپتے رہے، وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ شکایتیں ہوئیں تو سموسے اور منگا لیے گئے۔

"دنگا دنگا تو چلتا رہے گا، پریس کالونی کا کیا ہوا ؟ دنگے کی وجہ سے لیٹ تو ہو گیا ہے، لیکن دنگا ختم ہوتے ہی الاٹمنٹ ہو جانا چاہیے۔"

"ہو جائے گا۔ دنگا نہ ہوتا تو اب تک ہو گیا ہوتا۔ زمین تو طے ہو گئی ہے، ایک دم سول لائنز کے بیچ میں ہے۔ بس پلاٹ کٹنا ہے۔ دنگا ختم ہوتے ہی کٹ جائے گا۔"

کچھ صحافیوں نے اب تک پلاٹ کے لیے درخواستیں نہیں دی تھیں۔ انھوں نے شور مچایا کہ انہیں آخری تاریخ کا پتا نہیں چلا۔ انھیں بتایا گیا کہ وہ پچھلی تاریخ میں درخواست دے دیں۔ ان میں سے کئی نے کاغذ پھاڑا اور درخواست لکھنے بیٹھ گئے۔

صحافیوں کو حکام نے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم کر کے سمجھا دیا کہ کیسی رپورٹنگ کرنی ہے۔

منشی بر پرشاد اور کامریڈ سورج بھان باہر نکل آئے۔ کامریڈ سورج بھان تو زبردستی پریس کا نفر نس میں بیٹھ گئے تھے؟ انھیں امن کمیٹی کے اجلاس میں بلایا گیا تھا۔ وہ اُدھر چلے گئے۔ ساتھ میں منشی ہر پرشاد کو لیتے گئے۔ وہاں ابھی دیر تھی۔ زیادہ تر حصہ لینے والے باہر گھوم رہے تھے۔ کوئی پاس بنوانے لگا تھا تو کوئی پر یس کا نفر نس والے کمرے میں تاک جھانک کر رہا تھا۔ جب تک حکام لوگ امن کمیٹی کے پنڈال میں نہ آجائے تب تک یہی ہونا تھا۔

دونوں ایک کونے میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ ان کے ارد گرد اور لوگ بھی آ گئے اور پھر بات چیت فساد کی شروعات، مرنے والوں کی تعداد اور نقصانات پر مرکوز ہو گئی۔

" دنگا کسی نے شروع کیا ہو، کامریڈ سورج بھان غمزدہ لہجے میں بولے، ایک بات اب بڑی صاف دکھائی دینے لگی ہے۔ آزادی کے وقت بھی دنگے ہوتے تھے تو ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہوا کرتی تھی جو دنگا کرانے والی طاقتوں کے خلاف کھڑے ہوتے تھے۔ اب ایسے لوگوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔

" اجی ، اب تو پڑوسی بھی پڑوسی کو نہیں بچاتا۔ پہلے کم سے کم پڑوسی کا یہ بھروسا رہتا تھا کہ وہ حملہ نہیں کرے گا، لیکن اب تو یہ بھی نہیں رہا۔"

" رام پال سنگھ پرانے کمیونسٹ ہیں۔ پچھلے بیس سال سے کارڈ ہولڈر ہیں۔ ان کا لڑکا دنگے میں مارا گیا۔ میں ماتم پرسی کرنے گیا تو دنگ رہ گیا۔ اتنا بڑا آدمی فرقہ پرست ہو گیا۔ کھلے عام مسلمانوں کے خلاف بول رہے تھے۔ میں نے کہا بھی کہ کامریڈ، تمھیں مسلمانوں کے خلاف نہیں بلکہ ان طاقتوں کے خلاف بولنا چاہیے جو فساد کراتی ہیں، لیکن کون سنتا ہے۔ اس وقت تو لگتا ہے پورا شہر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بٹ گیا ہے۔"

"منشی ہر پر شاد نے کامریڈ سورج بھان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ ان کا درد سمجھ رہے تھے۔ وہ کئی دنوں سے کامریڈ کو رات رات بھر اپنے ساتھیوں سے الجھتے دیکھ رہے تھے۔ اکثر رات کو کامریڈ سورج بھان ان کے گھر آتے اور غمزدوں کی طرح آہ وزاری کرنے لگتے۔

سب کچھ ختم ہو رہا ہے منشی جی، ایسے ایسے ساتھی فرقہ پرست ہو گئے ہیں جو پچھلے بیسیوں سال سے اس کا مقابلہ کرتے آئے ہیں۔“

منشی جی سنتے اور خاموشی سے سر ہلاتے رہتے۔ وہ خود دیکھ رہے تھے کہ جو لوگ پچھلے دنگوں میں بڑھ چڑھ کر امن مارچ میں حصہ لیتے تھے یا اختلافات کے خلاف اپنے اپنے محلوں میں لوگوں کو نصیحت کرتے تھے، وہ بھی ہندو یا مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ حال ہی کے دنوں میں ممکن ہوا تھا کہ پڑوسی کا پڑوسی پر سے یقین ہٹنا شروع ہو گیا تھا۔ پہلی بار انھوں نے دیکھا کہ پڑوسیوں نے پڑوسیوں پر حملہ کیا اور ان کے گھروں میں لوٹ پاٹ کی۔ شاید پچھلے کچھ برسوں سے دونوں فرقوں کے درمیان لگاتار بڑھتے ہوے زہر کا اثر تھا جس نے آخر کار یہاں تک پہنچا دیا تھا۔

افسروں کے پنڈال میں آتے ہی امن کمیٹی کے جو لوگ باہر گھوم رہے تھے، دھیرے دھیرے اندر آنے لگے۔ پریس کانفر نس ختم ہونے کی وجہ سے اخبار والوں میں سے بھی کچھ اس پنڈال میں آ گئے۔

"عزت ماب ضلع مجسٹریٹ، شریمان کپتان صاحب، ہمارے درمیان موجود افسران والا، اس شہر کے معزز شهری بہنو اور بھائیو، جس طرح ہر اجلاس کے لیے صدارت کی ضرورت ہے، میں مکرجی دادا کا نام اس اجلاس کی صدارت کے لیے پیش کرتا ہوں۔“

"ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔"

جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی مکر جی دادا صدارت کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ برسوں سے ان اجلاسوں کی صدارت کر رہے تھے، اس لیے پہلے سے تیار ہو کر آتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی اب اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ صدارت قبول کرنے کے اس تماشے کو ایک ضروری حرکت کے طور پر قبول کرنے لگے تھے۔

مکرجی دادا کے ایک طرف کلکٹر اور دوسری طرف کپتان بیٹھے تھے۔ اسٹیج پر دو ممبر اسمبلی اور ایک ممبر پارلیمنٹ بھی بیٹھ گئے تھے۔ اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ ان صاحب نے صدارت کے لیے نام پیش کیا تھا وہ ، ماجد صاحب، پیشے سے وکیل اور کوتوالی کے جلسوں کے مقامی منتظم تھے۔ انھوں نے مائیک ہاتھ میں لیا اور شروعات اپنی تقریر سے کر ڈالی۔ لوگ ان کی اسی عادت سے اوبتے تھے۔ وہ کسی مقرر کو بلانے سے پہلے کافی لمبی تمہید باندھا کرتے تھے۔ شعر و شاعری سے بھری اپنی تمہید کے بعد وہ اگلے مقرر کو بلائے اور اس کے مائیک پر آتے آتے اسے تین چار بار وقت کا دھیان رکھنے کی ہدایت کرتے۔ بہت کم مقررین ان کی اس صلاح پر دھیان دیتے۔ اکثر تو مقررین اور ان میں مائیک کی چھینا جھپٹی ہو جاتی۔

آج بھی ماجد صاحب نے کئی شعر سنائے اور بیٹھے ہوؤں کو یاد دلایا کہ چمن کو سُرخ لہو کی نہیں بلکہ سُرخ پھولوں کی ضرورت ہے۔ جب لوگ کافی بور ہو گئے اور آوازے کسنے لگے تب انھوں نے مقررین کو بلانا شروع کیا۔

اسٹیج کے پیچھے قنات لگی تھی۔ اس قنات سے ہٹ کر چار پانچ مجسٹریٹ اور پولیس افسر کرسیوں کو اس طرح ڈالے بیٹھے تھے کہ ان کی کھسر پھسر اسٹیج پر بیٹھے ان کے اعلی افسروں تک نہ پہنچے۔ جب بھی کوئی مقر ر پوری سنجیدگی سے شہر کو جلنے سے بچانے کی اپیل گلا پھاڑ پھاڑ کر کرتا، یہ لوگ اس کی ماں بہن کرنے لگتے۔

سالا یہاں امن کا اپدیش دے رہا ہے، اپنی گلی میں جا کر مچھر سے بانٹے گا۔

انھیں سالوں کو بند کر دو تو دنگا اپنے آپ رک جائے گا۔"

" پر کیسے کر دیں ؟ افسران انہیں داماد کی طرح کو توالی میں ہلا کر چاے سموسا کھلاتے ہیں۔"

" افسران کیا کریں ! نہ کھلائیں تو منتری ڈنڈا کر دے گا۔"

" ان کی آواز یا ہنسی کبھی تیز ہو کر اسٹیج کی کرسیوں سے ٹکرانے لگتی۔ کوئی اسٹیج پر سے آنکھیں تحریر کر دیکھتا اور یہ لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ دبا کر تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتے۔ تھوڑی دیر بعد ان کی کھلکھلاہٹ یا آواز پھر سے بھنبھنا نے لگتی۔

بھائیو! جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، ہمارے دیش کی نوکر شاہی کو ہماری یاد تبھی آتی ہے جب حالات ان کے کنٹرول سے باہر ہو جاتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جب وقت گلشن کو پڑا لہو ہم نے دیا، اور جب آج بہار آئی ہے تو پوچھتے ہیں، تم کون ہو ؟ پہلے ہمیں یہاں بلایا نہیں گیا۔ بہر حال ، اب جب بلا ہی لیا گیا ہے تو بتا دیتے ہیں کہدنگاکیسے کنٹرول ہوگا...

ضرور بتاؤ بیٹا! تم نہیں بتاؤ گے تو دنگاکنٹرول کیسے ہو گا!"

پیچھے کی کرسیوں سے کی گئی یہ سر گوشی اتنی تیز تھی کہ مقرر کے سوا سبھی نے سنا۔ اسٹیج پر بیٹھے حکام مسکرائے۔ اگلی قطاروں میں بیٹھے لوگوں میں سے کچھ نے دانت نکال دیے لیکن مقرر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ جو بھائی پولیس اور پی اے سی کے خلاف بول رہے ہیں وہ ہمارے دیش کی قوت توڑ رہے ہیں۔ وہ سی آئی اے اور فلسطین کے ایجنٹ ہیں..."

" فلسطین؟ یہ فلسطین کب سے آ گیا دنگا کرانے ؟"

" میرا مطلب ہے فلسطین نہیں بلکہ چین ... میرا مطلب ہے جاپان ... "

" ابے تیرے مطلب سے ہمیں کیا لینا دینا ! "

ہنگامہ ہو گیا اور تھوڑی دیر میں سکون ہو گیا۔ اگلا مقرر بلا لیا گیا۔ اس طرح کے جلسوں میں تو ایسے ہنگامے ہوتے ہی رہتے تھے، لہذا کسی نے زیادہ پروا نہیں کی۔

بولنے والے کو چھوڑ کر کسی کو کسی تقریر سے دل چسپی نہیں تھی۔ کبھی کسی شعر یا چٹکلے پر بھلے دوسروں کا دھیان ملتفت ہو جائے، نہیں تو بولنے والے اور سننے والے اپنی اپنی رو میں بہے جا رہے تھے۔

پنڈت ایودھیا ناتھ دیکشت شہر کے ممبر اسمبلی تھے، اسٹیج پر حکام کے ساتھ بیٹھے تھے، لیکن اپنی تقریر ختم کر کے نیچے چلے گئے تھے۔ وہ پریشان تھے کیوں کہ یہ دنگا ان کے سیاسی کریئر کے لیے خطر ناک تھا۔ پچھلے چناؤ کے وقت بھی دنگا ہوا تھا، لیکن اس وقت دنگا ان کے فائدے میں گیا تھا۔ اس وقت ان کے پرانے حریت رام کشن جیسوال فساد کا فائدہ اٹھا ر ہے تھے۔ چناو بالکل سر پر تھا۔ انھیں پورا شک تھا کہ دنگا رام کشن جیسوال ہی نے کرایا ہے۔ رام کشن تھا تو پورا ہندووادی لیکن حاجی بدرالدین بیڑی والے سے اس کی پڑتی بھی خوب تھی۔ پورا شہر جانتا تھا کہ جیسوال اور حاجی جب مل کر چاہیں ، شہر میں فساد ہو جائے گا۔ چناو کے وقت فساد ہونے سے خطرہ یہی تھا کہ ووٹر ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ مسلمان حاجی بدرالدین کے پیچھے غول بند ہوں گے تو ہندو بھی کسی ہندو نیتا کی تلاش میں جیسوال کی موافقت میں اکٹھے ہو جائیں گے ۔ اس چکر میں مارے جائیں گے پنڈت ایودھیا نا تھہ دیکشت۔

دیکشت جی اسٹیج سے اتر کر ایک کونے میں کھڑے ہو کر اپنے حامیوں سے بات چیت کرنے لگے۔ بات کم کر رہے تھے، رام کشن جیسوال کی تگڑم بازی پر دھیان زیادہ رکھ رہے تھے۔ سالا کیسے کلکٹر سے مسکرا مسکرا کر بات کر رہا ہے۔ اس کلکٹر سے بھی نپٹنا ہے۔ کم بخت نے جیسوال کو نیچے سے بلا کر اسٹیج پر بٹھا لیا۔ چناو کے اعلان سے پہلے ہٹوانا ہے۔ بدمعاش جانتا نہیں کہ فساد رام کشن جیسوال اور حاجی بدرالدین نے مل کر کروایا ہے۔ میں نے منع کیا تھا کہ ان لوگوں کو امن کمیٹی کے اجلاس میں نہ بلایا جائے۔ پھر بھی نالائق نے نہ صرف دونوں کو بلایا بلکہ اسٹیج پر اپنے پاس بٹھایا ہے۔ اس لیے دیکشت جی نے آج تقریر میں ضلعی انتظامیہ کی کافی کھنچائی کر دی۔ کہیں کوئی رلیف تقسیم نہیں ہوئی۔ پورا شہر گندگی سے بجبجا رہا ہے اور ضرورت کا سامان نہ ملنے سے فر یا دور فریاد کر رہا ہے۔ دیکشت جی یہ بھول کر کہ وہ کسی اجلاس میں شریک ہیں، زور زور سے اپنے حامیوں کے درمیان ضلعی انتظامیہ کو کوسنے لگتے ہیں۔

دیکشت جی کی پریشانی سے رام کشن جیسوال اور حاجی بدرالدین بیڑی والے دونوں کو مزہ آ رہا ہے۔ دونوں بیچ بیچ میں ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھ مارتے ہیں۔ دونوں زبردستی مسکرا مسکرا کر کلکٹر سے بات کرتے ہیں۔ دیکشت جی دور سے دیکھ کر دانت پیستے ہیں۔ اس کلکٹر کو تو دنگاختم ہوتے ہی ہٹوانا ہے۔ کلکٹر بھی اس موقع شناسی کو سمجھ رہا ہے، اس لیے وہ کنکھیوں سے دیکشت جی کو دیکھتے ہی جیسوال اور حاجی دونوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن دونوں زبردستی جنگ کر باری باری اس کے کان میں کچھ کھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے مجبوراً سر بلانا پڑتا ہے۔

کلکٹر نے اپنی جگہ بدلنی چاہی۔ وہ جیسوال اور حاجی سے دور بیٹھنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اسٹیج کے کنارے پر پولیس کپتان بیٹھا تھا۔ اس نے کپتان کو اشارہ کر کے جگہ بدلنے کی کوشش کی لیکن کپتان نے اس کا اشارہ سمجھنے سے انکار کر دیا۔ دراصل اسے کلکٹر کی پریشانی میں مزہ آ رہا تھا۔ کلکٹر نے پچھلے کئی دن سے اسے دکھی کر رکھا تھا۔ وزیروں سے اس کی شکایتیں کی تھیں کہ پولیس اسے پورا تعاون نہیں دے رہی ہے۔ اپنے بھروسے کے اخبار نویسوں کے ذریعے اس نے پولیس کے خلافت خبر میں پلانٹ کرائی تھیں، اس لیے کپتان نے بھی آج سے اپنے خاص صحافیوں کو بر ایف کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایودھیا نا تھ دیکشت صاحب اقتدار ممبر اسمبلی تھے۔ ان کا استعمال کلکٹر کے خلاف ہو سکتا ہے، یہ کپتان کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے دھیرے سے اپنے ایک ماتحت کو بلا کر اس کے کان میں کہا کہ دیکشت کو جا کر اس اجلاس کے بعد ملنے کو کہئے۔ ماتحت اس کا حکم بجا لایا۔ کلکٹر نے کپتان کی سرگوشی اور ماتحت کا دیکشت تک جانا دیکھا۔ اس نے کپتان سے نپٹنے کے لیے نئی بساط بچھانی شروع کی۔

مقررین کی تقریریں اتنی دیر تک چلیں کہ جو بولنے کو رہ گئے تھے انھیں چھوڑ کر سب کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ جنھوں نے اجلاس بلایا تھا وہ بھی بور ہو گئے۔ اسٹیج پر بیٹھے دو تین لوگوں نے ماجد صاحب کو بلا کر ان کے کان میں کچھ کہا۔ ماجد صاحب نے ہر بار سر بلایا لیکن ہر بار مائیک خالی ہوتے ہی پہلے اپنے دو تین شعر سنائے، پھر دوسرے مقرر کو بلایا۔ آخر میں کلکٹر نے ماجد صاحب سے سختی سے کچھ کھا اور انھوں نے صدر کو صدارتی تقریر کے لیے مدعو کیا۔ جو لوگ تقریر کرنے سے رہ گئے تھے انھوں نے ہنگامہ کر دیا۔ تھوڑی دیر تک شور شرابے میں کچھ سنائی نہیں دیا۔ اسی افراتفری میں ایک آدھ لوگ آئے اور تقریر کر کے چلے گئے۔ بڑی مشکل سے صدرنے کھڑے ہو کر مائیک پر قبضہ کیا۔

صدر مکرجی دادا کی تقریر لوگ پچھلے کئی برسوں سے سنتے آرہے تھے۔ آج بھی انہیں پتا تھا کہ کہاں وہ لطیفے سنائیں گے ، کہاں تالی بجانی ہے اور کہاں "شیم شیم “ کی آوازلگانی ہے۔ ایک آدھ جگہ وہ بھول گئے تو حاضرین نے انہیں یاد دلا دیا۔ بہر حال ، ان کی تقریر ختم ہونے سے پہلے ہی لوگ کھڑے ہو گئے اور ان کے آخری الفاظ کرسیوں ، قدموں اور لوگوں کی آواز میں دب گئے۔ بغل میں ایک شامیانے میں چائے ناشتے کا انتظام تھا۔ لوگ اس میں دھنس گئے۔

چاے پان کے دوران چاپلوسی اور خوشامد کے دور چلتے رہے۔ نیتا، افسر، صحافی اور سوشل ور کر بغض، حسد اور جلن کے ساتھ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے ہر موقعے کا استعمال کرتے رہے۔ فساد تو ہر دوسرے تیسرے سال ہونا ہی تھا، اس کے بارے میں بہت فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی بھی دھوکا دھڑی کے چھوٹے سے چھوٹے موقعے پر چوکنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے سبھی نے اس موقعے کا بھر پور فائدہ اٹھا یا۔

۸

تلاشیاں جاری تھیں۔ ہر دو تین برس میں اس کی نوبت آتی تھی، اس لیے سب کچھ کافی حدتک حسبِ معمول سا تھا۔ جس سال فوج آجاتی تھی اس سال فوج کے ذریعے، نہیں تو بی ایس ایف، سی آر پی، جو بھی تعینات ہو، اس کے ذریعے، شہر کے پاکستانی حصے کو گھیر کر سول پولیس اور پی اے سی کے لوگ تلاشیاں لیتے تھے۔ افسروں کو پورا یقین رہتا تھا کہ فساد اسی حصے کے لوگ کرتے ہیں ، اس لیے تلاشیاں انھیں علاقوں کی ہوتی تھیں۔ کسی کسی سال جب مرنے والوں میں یہیں کے لوگ ہوتے تھے تب بھی یہ تلاشیاں صرف انھیں محلوں کی ہوتی تھیں۔ اس بار بھی مرنے والے سبھی لوگ یہیں کے تھے، مگر افسروں نے شہر کے پاکستانی حصے کی تلاشی کے طریق کار کا تعین کر کے رات ڈیڑھ بجے سے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

اس دن بھی اس بھری سڑی گرمی کے پسینے میں نہایا ہوا شہر اس وقت ہلکی ٹھنڈی بسیار کی خوش فہمی کا شکار ہو چکا تھا۔ صرف وہ لوگ جنہیں دن بھر کمانے کے بعد ہی راست میں کھانا ملتا ہے اور جن کی بھو کی آنتوں کی اینٹھن نے نیند کو ان آنکھوں سے دور بھگا دیا تھا، آدھے سونے آدھے جاگنے کی حالت میں تھے۔ باقی پورے علاقے میں سوتا پڑا ہوا تھا۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے تک تو ضرور ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعرے ہر طرف بہتے ہوے گھروں کی چھتوں سے ٹکراتے رہے تھے، مگر ایک گھنٹے سے ان کی رفتار بھی کم ہوتے ہوئے قریب قریب ختم ہو گئی تھی۔ یہ نعرے عجیب طرح کا جوش اور خوف پیدا کرتے تھے اور ہر گھر کے رہنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پڑوس ہی میں کوئی حملہ آور بھیڑ یہ نعرے لگا رہی ہو۔

ڈیڑھ بجے کے بعد گلیوں کے باہر بڑی سڑکوں پر گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ گاڑیوں کی ہیڈلائٹس سے سڑکوں اور گلیوں کے اندھیرے کونے روشن ہوگئے۔ روشنی کے کچھ جھونکے لوگوں کی کھڑکیوں اور روشن دانوں سے ہو کر اندر گھروں میں بھی پہنچے۔ خوف زدہ ہاتھوں نے جلدی جلدی پلے بھیڑ دیے۔ اس کے بعد شروع ہوا بوٹوں کا متر نم شور۔ ٹرکوں سے کود کود کر جوانوں سے پوزیشن لینی شروع کی۔ رات کے سناٹے میں بوٹوں کی آواز میں ایک خاص طرح کی سنسنی پیدا کر رہی تھیں۔ گھروں میں نیم غنودہ لوگ آنے والی مصیبت کے لیے تیار ہونے لگے۔

کھٹ کھٹ کھٹ... کھول ہے! ... ابے کھول دروازہ ! سالے کہاں اپنی ماں کی گود میں سوئے بیٹھے ہیں۔ کھولتا ہے دروازہ کہ توڑ دوں ؟ "

آوازیں، صرف آواز یں پورے ماحول میں بکھر گئیں۔ آواز یں ہاتھوں سے دروازہ پیٹنے کی تھیں، آواز یں بوٹوں سے دروازوں پر ٹھوکر مارنے کی تھیں، آوازیں بچوں کے رونے اور عور توں کےچیخنے کی تھیں، آوازیں کندوں کے پیٹھ یا پیر پر شکرانے کی تھیں، آوازوں میں گالیاں ، سکیاں اور گڑ گڑاہٹ بھری تھی۔ یہ آواز میں اچانک پیدا ہوئیں اور انھوں نے پورے ماحول کو متھ ڈالا۔

! اتنی دیر تک دروازہ پیٹتے رہے، اب جا کر دروازہ کھولا! اندر اسلحہ چھپارہے تھے ؟"

"بہن

"بولتے کیوں نہیں سسرا ، اب زبان میں تالا لگ گیا ہے!"

کمرے کے فرش پر بچے نیند میں گم بکھرے تھے اور بالغ افراد دہشت سے حیرت زدہ خاموش بیٹھے تھے۔ دروازہ ٹوٹتے ہی بھڑ بھڑا کر ڈھیر سارے لوگ بندوقوں کے ساتھ اندر گھس آئے۔ مردوں نے عادتاً اپنے ہاتھوں سے سر ڈھک لیا۔ انھیں توقع تھی کہ اب ڈنڈوں، بوٹوں اور بندوق کے بٹوں سے ان کی پٹائی شروع ہو گی۔ پٹائی شروع ہو گئی ہوتی لیکن ایک عورت کی چیخ نے پورے کمرے کی رُکی ہوئی ہوا میں کپکپی پیدا کر دی۔

" ہے مولا! اب بٹیا کی لاش بوٹن تلے روندی جائے گی!

" کمرے میں گھستے ہوے لوگ چاروں کونوں میں پھیلنے کے چکر میں نیچے قریب قریب لیٹے ہوے بچوں کو کچلنے میں مصروف تھے۔ بچوں کے بیچ میں چادر سے ڈھکی ہوئی لاش تھی۔ جیسے ہی کوئی بوٹ اس پر پڑنے کو ہوا، سعیدہ کی چیخ نکل گئی۔

" کیا بکتی ہے ! کس کی لاش ہے؟"

سعیدہ نے جواب دیے بنا رونا جاری رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ساس اور نند نے بھی رونا شروع کر دیا۔ بوڑھے نے بڑی مشکل سے وضاحت کی۔ ہڑ بڑائے ہوے سارے بوٹ باہر نکل گئے۔ دروازہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔ بوڑھے نے ٹوٹے ہوے دروازے کے پتوں کو بھیڑ کر ان پر ایک ٹوٹی میز لگا دی۔ باہر کا منظر ضرور ان ٹوٹے پلوں سے اوجھل ہو گیا، لیکن آوازیں آتی رہیں۔

" اس بکسے میں کیا ہے ؟ کھول ... کھول اسے بھی !

حضور ، مائی باپ، لڑکی کے زیور گریاں ہیں۔ اسی جاڑے میں شادی کرنی ہے۔"

" کھول تو۔ دیکھیں تھی تو پتا چلے گا کہ زیور ہیں یا بم چھپا کر رکھا ہے۔ تم لوگوں کا کوئی بھروسا ویسے بھی نہیں کرنا چاہیے۔ پاکستان سے لالا کر بم پستول اکٹھا کرتے ہو۔ "

"کھول سا لے، ایک ایک گھر میں اتنی دیر کریں گے تو دو ہی گھر میں صبح ہو جائے گی۔"

"سیدھے سے نہیں کھولے گا تو منہ بھی توڑ دیں گے اور تالا بھی۔"

" بندوق کا کندا دونوں کو توڑ سکتا ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تالا ٹوٹتے وقت تیز آواز کرتا ہے اور آدمی کا منہ صرف ادھوری سی اوہ ! " کی فریاد نکال پاتا ہے۔

"حضور! بڑی مشکل سے اکٹھا کیا ہے۔ بیٹی کی شادی نہیں ہو پائے گی۔“

" پتلون کی جیب میں پڑے ہوے ہاتھ پر کمزور ہاتھ تھر تھراتا جُھول جاتا ہے۔ کندئے کی دوسری چوٹ کسی کو اس لائق نہیں چھوڑتی کہ وہ مضبوط ہاتھ کو پکڑنے کی پھر جرات کرے۔ جب تک بوٹ باہر نکلتے ہیں ، گھر کے سارے مرد عورت رونے چلانے لگتے ہیں۔ بچے بھی گھبرا کر ذرا زیادہ اونچی آواز میں روتے ہیں ، لیکن جانے والوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

تلاشی کا اختتام تقریباً سبھی گھروں میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ آخر میں سیاہ، راکھ پُتے چہرے اگر آنسوؤں سے تر نہیں ہوئے تو بے عزتی اور غم سے بجھے بجھے، جاتے ہوے بوٹوں کی آواز سنتے رہتے ہیں۔

ابے دروازہ اتنی دیر میں کیوں کھولا ؟ "

" سوریا تھا۔ نیند کھلی تو کھولا۔"

"کیا ؟ زبان لڑاتا ہے ! " تراق... تراق...

" مارا کیوں ؟ مارنے کا اختیار کس نے دیا تمہیں ؟"

" سالا اختیار پوچھتا ہے ؟ اس نے دیا اختیار ! "

رائفل کا بٹ آدھا منہ پر اور آدھا دروازے پر پڑتا ہے۔پچ سے منہ سے خون تھوکا جاتا ہے اور خون کے ساتھ ساتھ دو تین دانت بھی باہر آ گرتے ہیں۔ گھر کے بزرگ عورت مرد آ کر جوان سے چمٹ جاتے ہیں ۔ گھر کا بوڑھا مُکھیا خون دیکھ کر جوش میں دھیرے دھیرے کانپنے لگتا ہے۔ سامنے کھڑے مجسٹریٹ سے آواز پر قابو کر کے بات کرنے کی کوشش کرتے کرتے بھی اس کی آواز دھیرے دھیرےتلخ ہونے لگتی ہے۔

" آپ کے سامنے سب کچھ ہو رہا ہے اور آپ چپ چاپ دیکھ رہے ہیں۔ یہی تلاشی کا انداز ہے ؟ کس قانون نے آپ کو اختیار دیا ہے مارنے پیٹنے کا ؟ میں بھی وکیل رہا ہوں۔ اس ملک میں نظام حکومت ہے... قانون ہے... قاعدہ ہے..."

" تو ہمیں قانون قاعدہ سکھائے گا ؟ وکیل کی ڈم ..."

" دنیا کا کوئی بوڑھا چہرہ اپنے اوپر بندوق کا کند اسہہ کر چپ چاپ کھڑا نہیں رہ سکتا۔

سالے کھاتے یہاں کا ہیں، دیکھتے پاکستان کی طرف ہیں۔ غور سے تلاشی لینا۔ اس بد معاش وکیل کے یہاں تو ٹرانسمیٹر بھی ہو گا۔ یہی سالے خبر دیتے ہیں۔ تبھی صبح صبح بی بی سی بولنے لگتا

پاکستانی..." خون بھرے منھ کو بے ڈھنگے پن سے چہا چبا کر نوجوان چہرہ پھنکارتا ہے، پہلے تو نہیں کرتے تھے لیکن اب ضرور کریں گے پاکستانی جاسوسی... اس سالے ملک میں اگر ذلت ہی ملنی ہے تو ضرور کریں گے پاکستانی دلالی...

"کیا کہا؟ کیا کہا؟ پاکستانی جاسوس ہے؟ تب تو پورا ہی بتائے گا کہ کہاں چھپا رکھا ہے ٹرانسمیٹر اور بم ؟"

بگڑا ہوا منہ تھوڑا اور بگڑ جاتا ہے لیکن عور تیں اس کے اوپر قریب قریب لیٹ جاتی ہیں۔ باپ کے گال کی چھٹی کھال دیکھ کر نوجوان پر بیچ بیچ میں جیسے ہسٹیریا کے دورے پڑتے جا رہے تھے۔ اسے بولنے سے روکنے کے لیے بوڑھے وکیل سمیت گھر کے سبھی افراد اسے گھیر کر بیٹھ گئے۔ کوئی بہلا کر کوئی پھسلا کر کوئی ڈپٹ کر اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے باوجود اس کی آواز تیز ہو جاتی تو کوئی نہ کوئی عورت اس سے تیز آواز میں اسے روک کر اس کی آواز دبانے کی کوشش کرتی۔

تلاشی لینے والوں کی دل چسپی اس میں ختم ہو چکی تھی۔ دو جوانوں کو ان کے پاس کھڑا کر کے باقی سب لوگ تلاشی لینے چلے گئے۔ کافی مالدار لوگوں کا گھر لگتا تھا اس لیے سب تلاشی لینے والے پوری طبیعت سے تلاشی لے رہے تھے۔ جن دو جوانوں کو گھر والوں کے سر پر کھڑا کیا گیا تھا، وہ بھی تھوڑی دیر میں اندر سرک گئے اور تلاشی میں شریک ہو گئے۔ گھر والے باہر کمرے میں دائرہ بنا کر صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کو تسلی دیتے یا چپ کراتے رہے۔ تلاشی لینے والے جب چلے گئے تو عورتوں نے جھپٹ کر اپنے زیوروں کے بکسوں یا نقدی کے ڈبے کو الٹ پلٹ کر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ مردوں نے انھیں ڈانٹا اور بوڑھے وکیل نے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

قریب قریب سبھی گھروں میں یہی تماشا ہوا ۔ صرف حاجی بدرالدین کے یہاں ناٹک کے مکالے بدل گئے۔ ان کا دو ایکڑ میں پھیلا مکان تھا۔ گھنے خوب صورت پام کے درختوں کے نیچے پھیلے الان میں مدھم نیلی روشنی پھیلی تھی۔ مکان کے چاروں طرف اونچی اونچی دیوار یں تھیں ، اس لیے باہر سے اندر کا کوئی منظر دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ مکان کا بڑا دروازہ کھول کر جب ایک ڈپٹی کلکٹر اور ایک ڈی ایس پی کی قیادت میں پولیس کا گروہ اندر گھسا توانھیں لگا جیسے تپتے ہوے ریگستان سے نکل کر وہ کسی سہانے ٹھنڈے نخلستان میں چلے آئے ہوں۔

یہ کرفیو میں کیسا مجمع لگارکھا ہے ؟" بولنے والے نے اپنی آواز میں کڑک بھرنے کی کوشش کی لیکن اس کی کڑک کا سننے والوں پر کوئی اثر نہیں پڑا کیوں کہ جملہ ختم ہوتے ہوئے وہ پھس سے ہنس پڑا۔

" آئے حضور ڈپٹی صاحب، کیسا کرفیو اور کہاں کا کرفیو! ہم تو اپنے گھر کے اندر بیٹھے ہیں"

تھوڑی دیر تک آپس میں اس بات پر دوستانہ بحث ہوتی رہی کہ کرفیو گھر کے اندرونی حصوں تک تھا یا باہر کی چار دیواری تک اس کی حد تھی۔ سپاہی لان کے باہر سیڑھیوں پر آرام سے بیٹھ گئے اور افسران گلاب کی باڑیں پھلانگتے ہوے لان پر پڑی کرسیوں پر جا کر پھیل گئے۔ تھکان اور کئی دنوں کی جاگ نے سب کو بری طرح توڑ ڈالا تھا۔ کمر سیدھی ہوتے ہی زیادہ تر لوگ اونگھنے لگے۔ حاجی کے آدمیوں نے جلدی جلدی ٹھنڈا پانی اور شر بت پیش کرنا شروع کر دیا۔

" اور کیا خدمت کریں صاحب؟ ایسا وقت ہے کہ کچھ خدمت بھی نہیں کر پارہے ہیں۔“

" ارے بہت ہے حاجی جی ، آج تو آپ کا ٹھنڈا پانی بھی امرت لگ رہا ہے۔"

"تھوڑا سا اچھا مال بھی رکھا ہے۔ اجازت دیں تو منگواؤں ؟ "

"نہیں نہیں... اس وقت اچھا برا کچھ نہیں چلے گا۔ افسر نے کنکھیوں سے دور بیٹھے ماتحتوں کی طرف دیکھا۔

اندر کمرے میں انتظام کرا دیتا ہوں۔ تھوڑا لے لیں۔ تکان دور ہو جائے گی۔

رہنے دیں حاجی جی، پھر کسی دن بیٹھیں گے۔"

اچانک ایک افسر نے لان کے ایک کونے میں دیکھا کہ اندھیرے میں رکھی کرسی پر کسی نے کروٹ بدلی۔ کرسی مہندی کی جھاڑیوں کی آڑ میں اس طرح پڑھی تھی کہ بہت دھیان دے کر دیکھنے پر ہی صاف دکھائی پڑ سکتی تھی۔ افسر نے چوکنا ہو کر پوچھا، “کون ہے ادھر جھاڑیوں کے پیچھے؟ کون ہے ؟“

ارے جیسوال جی، آجائیں۔ ادھر ہی آکر بیٹھے، نہیں تو صاحب لوگ سوچیں گے کہ میں نے کسی ہندو کو اغوا کر رکھا ہے۔"

رام کرشن جیسوال کچھ سٹپٹائے سے جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر آ گئے۔ جیسوال جی سابق ممبر اسمبلی تھے اور آنے والے چناو میں بھی کھڑے ہونے والے تھے۔ حاجی بدرالدین ان کے پرانے حریف تھے۔ مگر اس بار شہر میں افواہ تھی کہ موجودہ ممبر اسمبلی ایودھیا نا تھہ دیکشت کے خلاف دونوں نے ہاتھ ملا رکھا تھا۔

"جیسوال جی، کرفیو میں اتنی رات گئے آپ یہاں ؟ خیریت تو ہے ؟ ایک افسر نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"ہم تو ڈپٹی صاحب، شہر کے اندیشے سے پریشان ہیں۔ حاجی جی سے ڈسکس کرنے گلیوں گلیوں چھپتے آگئے تھے۔ دنگا کیسے روکا جائے ، اسی پر بات کر رہے تھے کہ آپ آ گئے۔"

" سالا کیسی بھولی بات کر رہا ہے! پورا شہر جانتا ہے کہ یہی دونوں دنگا کروا ر ہے ہیں مگر ان کو پکڑے گا کون ! دور سیڑھیوں پر بیٹھے ایک داروغہ نے دوسرے کے کان میں پھسھسا کرکہا۔

" چپ رہ یار، کیوں بُرا بنتا ہے! یہ کم بخت تو پردے کے پیچھے رہ کر کام کرتے ہیں اور ان کا پیسا سب کچھ کراتا ہے۔ انھیں کون پکڑے گا اور کیوں ؟ " دوسرے نے اپنی آواز کو دباتے ہوے کہا۔

ڈی ایس پی نے ڈپٹی کلکٹر کو آنکھ سے کچھ اشارہ کیا اور دونوں لان کے کونے میں چلے گئے۔

"مجھے بھائی صاحب، کچھ گڑ بڑ لگ رہا ہے۔ جیسوال کا اس وقت یہاں ہونا شک پیدا کرتا ہے۔ کہیے تو اندر تلاشی لی جائے۔ کچھ مل سکتا ہے۔"

" آپ بھی شرماجی بچوں جیسی بات کرتے ہیں! حاجی کیا اپنے گھر میں اسلحہ رکھے گا؟ یا جیسوال خود با قو چلائے گا ؟ ارے ان کا تو صرف پیسا اور دماغ کام کرتا ہے۔ ان کے یہاں تلاشی لینے سے کیا لے گا ؟ کل ہمارا تبادلہ ضر ور ہو جائے گا۔"

دونوں دیر تک کھڑے کھڑے دھیمی آواز میں بات کرتے رہے۔ لان میں بیٹھے حاجی اور جیسوال تھوڑی بے چینی سے ان کی بات چیت ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جیسوال بات چیت کو لمبا کھنچتے دیکھ کر نروس ہونے لگا لیکن حاجی اسے ہاتھ یا آنکھ کے اشارے سے لگاتار مطمئن کرتا رہا۔ دونوں افسر واپس آکر بیٹھ گئے۔ بات چیت پھر شروع ہو گئی۔ جیسوال نے بتایا کہ حاجی جی نے کس طرح محلے کے غریب ہندوؤں کے لیے لنگر کھول رکھا ہے۔ ان کے آدمیوں کو آسانی سے کرفیو پاس نہیں مل پا رہے ہیں اس لیے وہ چاہتے ہوے بھی سب تک مدد نہیں پہنچا پار ہے ہیں۔ حاجی نے بھی جیسوال کے ذریعے اپنے پڑوسی مسلمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دینے کی بات افسروں کو سنائی۔ اندر سے اس بیچ چائے بن کر آ گئی۔

ا بھی تو ٹھنڈا پیا ہے۔ اب چاہ کا تکلف کیوں!"

"تکلف کیسا صاحب! میں تو شرمندہ ہوں کہ ایسے موقعے پر آپ تشریف لائے ہیں کہ کچھ خاطر نہیں کر پا رہا ہوں۔

” کبھی فرست سے پروگرام بنائیے۔ بیگم صاحب مرغا بہت اچھا پکاتی ہیں۔ حاجی جی ، اب کرفیو ہٹے تو صاحب لوگوں کو دعوت دیجیے، جیسوال نے کہا۔

میں تو ہمیشہ خدمت کو حاضر ہوں۔ آپ لوگوں کو جب فرصت ہو..."

" دیکھیں گے... دیکھیں گے حاجی جی۔ بس کرفیو سے جلدی آپ لوگ چھٹی دلائیے۔"

" اجی میری اور جیسوال کی طرف سے تو آپ کرفیو کل بٹاتے ہوں تو آج ہٹا لیجیے۔ ہم تو امن کے لیے کوئی بھی قربانی کر سکتے ہیں۔"

"سوتو ہے... میرا مطلب ہے کہ جو دنگا کرارہے ہیں وہ فرصت دیں تو دعوت وادت بھی تبھی رکھی جا سکتی ہے۔

افسر کھڑے ہوئے۔ ماتحتوں نے بھی دھول جھاڑی، اپنی بندوقیں وغیرہ سنبھالتے ہوے اٹھ گئے۔ آٹھ دس لوگوں کا قافلہ دھیرے دھیرے پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ پھاٹک پر کھڑے ہو کر حاجی بدرالدین نے ہاتھ ماتھے تک لا کر سلام کیا۔ اب اس سے باہر نکلنے کے لیے تو آپ سے پاس لینا پڑے گا۔

جیسوال اور افسر دھیرے سے ہنسے۔ ایک ایک کر کے گاڑیاں اسٹارٹ ہو ئیں اور حاجی نے بڑا دروازہ دھیرے دھیرے بند کر دیا۔ سناٹے میں تھوڑی دیر تک صرف گاڑیوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور ہیڈلائٹس کی روشنی گلیوں کی دیواروں پر ناچتی رہی۔

۹

باہر جب تک دروازوں کے پیٹنے ٹوٹنے، گلیوں میں بوٹوں کے دوڑ نے چلنے، یا لوگوں کے چیخنے سسکنے کی آوازیں آتی رہیں ، تب تک گھر میں سبھی افراد سے ڈرے سے بیٹھے رہے۔ آوازیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ تلاشیاں چل رہی ہیں۔ یہ گھر تلاشی لینے والوں کی مستعدی سے ڈرے ہوے لوگوں کا گھر تھا۔ تلاشیوں کا دور اتنا لمبا کھینچ رہا تھا کہ ناتمام سا لگنے لگا تھا۔ کسی طرح یہ سلسلہ ختم ہونے کو آیا اور آوازیں دھیرے دھیرے ختم ہو گئیں۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ساتھ بہت سی چھوٹی اور بڑی گاڑیاں اسٹارٹ ہوئیں، اس لیے ان کی آواز حملہ آور شہد کی مکھیوں کی طرح پوری گلی میں چھا گئی۔ بہت ساری گاڑیوں کی ہیڈلائٹس کی روشنی ۔ ایک دم پوری گلی روشنی میں نہاتی چلی گئی۔ جب اس روشنی سے نجات پا کر گلی پھر سے اندھیرے کی تاریکی میں کھو گئی تب گھر کے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ تلاشی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد انھوں نے پھر اونگھنا شروع کر دیا۔

پڑوس کے کنجڑے کے مرغ نے غیر فطری طور سے بانگ دی۔ شاید رات بھر کی بے چینی نے اسے غصے سے بھر دیا تھا۔ اس کے کڑکڑانے کی آواز نے سعیدہ کی ساس کو سب سے پہلے جگایا۔ بڑھیا ویسے بھی بہت ہلکی نیند سوئی تھی، آج تو اسے ڈھنگ سے نیند آئی بھی نہیں تھی۔ اس نے جھپٹ کر کونے میں پڑے اسٹول پر رکھی میز گھڑی میں وقت دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک تو گھڑی بہت چھوٹی تھی ، دوسرے اسٹول پر ایک صراحی بھی رکھی ہوئی تھی جس کی آڑ پڑنے کی وجہ سے گھڑی کی سوئی صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بڑھیا نے مدد کے لیے کمرے میں نظر دوڑائی۔ دیوار سے سر ٹکائے لیٹے لوگوں کو دیکھنے سے یہ تو عیاں ہو گیا کہ ان میں سے کچھ آنکھیں موندے جاگ رہے ہیں، لیکن ان میں سے کسی سے بھی مدد کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

بڑھیا خود ہی اٹھی اور اس نے صراحی کو سر کا کر گھڑی کو دیکھا۔ چار بجنے والے تھے۔ بڑھیا گھبراہٹ کے مارے بے چین ہو گئی۔ اس نے صراحی کو ہلا کر تھاہ لی۔ صراحی بالکل خالی تھی۔ کل دن بھر اسے بھرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جو کچھ پیندے میں پانی کے قطرے تھے انہیں بھی صراحی کو دو تین بار پورا الٹ کر بچوں نے نچوڑ ڈالا تھا۔ بڑھیا نے پیچھے برآمدے میں باورچی خانے میں جا کر دیکھا۔ بالٹی میں قریب دو ڈھائی لوٹے پانی تھا۔ گھر کے اکیلے نل سے سُوں سُوں کی آواز آ رہی تھی۔ مطلب یہ کہ پانی جلد ہی آنے والا تھا۔ اس نے بالٹی نل کے نیچے لگا دی اور نل پورا کھول دی، حالاں کہ نل پورا کھولنا اس گھر میں محاورے سے زیادہ معنی نہیں رکھتا تھا۔ نل چاہے جتنا بھی کھولا جائے، پانی ہمیشہ ایک پتلی سی دھار کی شکل میں گرتا تھا جس سے بالٹی بھر نے سے پہلے آدمی کا صبر جواب دے جاتا تھا۔

بڑھیا نے بالٹی سے ملے دو لوٹے پانی سے اپنے روزمرہ کے کام نپٹانے شروع کیے۔ جب وہ پاخانے سے باہر نکلی تو نل سے دھیرے دھیرے پانی ٹپکنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ ٹل کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اونگھتے ہوے بالٹی کے تھوڑا بہت بھر جانے کا انتظار کرنے لگی۔ رات بھر کی جاگ نے اسے قریب قریب نیند کی حالت میں پہنچا دیا۔ مہوشیار وہ تب ہوئی جب اس کا سر نل کے پاس کھمبے سے ٹکرایا۔ اس نے ہڑ بڑا کر دیکھا، پانی تقریبا ایک چوتھائی بھر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کافی دیر آنکھیں بند کیے پڑھی رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی ایک لوٹے سے پانی نکالا۔ ایک چھوٹی سی ، کافی گھِسی ہوئی صابن کی بٹی پڑی تھی۔ اس سے اس نے اپنا ہاتھ مل مل کر دھویا۔ بٹی اتنی چھوٹی تھی کہ کافی رگڑنے کے بعد بھی اس میں جھاگ پیدا نہیں ہوا اور تھوڑاسا زور لگنے پر وہ پھسل کر نالی میں گر گئی۔ اور کوئی دن ہوتا تو بڑھیا اسے نالی سے چھان کر اٹھالیتی ، لیکن آج اس کا من جاگ کی تھکان اور گھر میں پڑھی بچی کی لاش سے اتنا بے حال تھا کہ اس نے صابن کے ٹکڑے کی پروا نہیں کی جسے وہ کم سے کم دو تین دن اور چلاتی، اور اگر گھر کے کسی اور بچے یا جوان سے یہ بٹی نالی میں گر گئی ہوتی تو گھنٹوں اس پر چیختی چلاتی۔

ہاتھ اور منہ پر ٹھنڈا پانی پڑنے سے اس کے بدن میں کچھ پھُر تی آئی۔ وہ اپنے کرتے اور شلوار سے اپنا ہاتھ رگڑتے ہوے جلدی جلدی اندر آئی۔ پانی جلد جا سکتا تھا۔ اگر تب تک سب لوگ اپنے کام کر لیں تو لاش کے عمل کا انتظام کیا جائے۔ حالاں کہ اس کا برسوں کا تجر بہ یہ بتاتا تھا کہ گھر میں اتنا پانی نہیں آ سکتا، لیکن پھر بھی باہر سے پانی بھر نے کا خیال اتنا کڑوا تھا کہ اس نے پورے من سے چاہا کہ لوگ اتنی جلدی جلدی اپنے کام پورے کرلیں کہ باہر جانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ دن بھر پینے کے پانی کی قلت رہے گی، اسے تو بعد میں دیکھ لیں گے۔ قبرستان سے لوٹتے ہوے گھر کے مرد پانی کی سبیل کرلیں گے۔

اندر سبھی لوگ ابھی سوئے ہوے تھے۔ صرف بوڑھا اپنی آنکھیں کھولے ایک ٹک جانے کہاں دیکھ رہا تھا۔ اس کی بے جان پُتلیوں کو دیکھ کر آسانی سے یہ بھی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے یا آنکھیں کھول کر سویا ہے۔ سعیدہ کی گردن دیوار پر ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی۔ اس کے کھلے منہ سے رال ٹپک کر اس کے آنچل سے ہوتی ہوئی اس کے گھٹنے تک چلی گئی تھی۔ رات بھر رہ رہ کر ماتم کرنے اور جاگنے کی وجہ سے اس کا کھلا ہوا منہ بے ڈول لگ رہا تھا۔ بڑھیا کا جی چاہا کہ دھیرے سے اس کا منہ بند کر دے اور رال پونچھ کر اسے چپ چاپ تھوڑی دیر سونے دے لیکن عادت سے مجبور اس کے منہ سے نکل ہی گیا، اری اٹھ کرم جلی، اب کیا دو پہر تک سوتی رہے گی ؟ حالاں کہ بڑھیا کی آواز روز کی طرح گرفت نہیں ہو پائی تھی پھر بھی اس کی تیزی کی وجہ سے سعیدہ نے بڑ بڑا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے اس کی پیٹھ دیوار سے لگی ہوئی ہے، اور اس نے جھپٹ کر اٹھنے کی کوشش کی، لیکن پوری طرح اٹھنے سے پہلے اس کی نگاہ سامنے فرش پر چادر سے ڈھکی اپنی چھوٹی بچی پر پڑی اور ایک بار پھر اس کا رونا شروع ہو گیا۔ پہلے اس نے سکیاں بھریں، پھر ایک دم گلا پھاڑ کر رونے لگی۔ اس نے پچھلے چوبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا، اس لیے جلد ہی اس کا گلا بیٹھ گیا اور اس کی آواز سسکیوں میں بدل گئی۔

سعیدہ کے رونے نے کمرے میں فرش پر پڑے سب بڑے لوگوں کو جگا دیا۔ بچے اب بھی سورہے تھے لیکن بڑوں نے ایک ایک کر کے اپنی جگہ سے اٹھنا شروع کر دیا۔ بڑھیا نے سب کو جلدی جلدی اپنے روز کے کام نپٹانے کے لیے للکارا۔ لوگوں نے ایک ایک کر کے پیچھے برآمدے کی طرف جانا شروع کر دیا۔

نل لگاتار کھلا رہا لیکن بالٹی صرف ایک بھر پائی۔ اس کا پہلے ہی سے بڑھیا کو اندازہ تھا۔ نل سے پانی جب آنا بند ہوا تو بالٹی کی تیہ میں صرف تھوڑا سا پانی اور بچا تھا۔ ابھی سارے بچے باقی تھے۔ اٹھتے ہی انھیں پانی کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے علاوہ سب سے ضروری کام لاش کو نہلانا تھا۔ بچی کو مرے بارہ گھنٹے ہو گئے تھے۔ رات میں یوں موسم بہت گرم نہیں تھالیکن جلد ہی موسم گرمانے لگے گا اور لاش میں سٹرن اور بد بو شروع ہو جائے گی، اس لیے بڑھیا چاہتی تھی کہ جلدی سے پانی کا انتظام ہو جائے تا کہ دفنانے کے لیے گھر سے نکلنے کی سبیل کی جاسکے۔

پانی صرف باہر کے سرکاری نل سے مل سکتا تھا۔ سعیدہ کے شوہر کو پچھلی صبح کا واقعہ ابھی بھولا نہیں تھا۔ بوڑھا کرفیو پاس بنوانے میں جتنا ذلیل ہوا تھا، اس کے بعد اس کی بھی ہمت نہیں تھی کہ باہر نکلے۔ حالاں کہ اب اس کے پاس کرفیو پاس تھا اور اسے لے کر باہر پانی لینے نکلا جا سکتا تھا، لیکن پھر بھی باہر پولیس والوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ انھیں کرفیو پاس پہاڑ کر پھینکنے اور اس کی پٹائی کرنے میں کوئی وقت نہیں لگنا تھا۔ اس کے من کے کسی کونے میں یہ خواہش زور مار رہی تھی کہ بڑھیا ہی پانی لانے باہر چلی جائے۔ اپنے کسی بھی لڑکے کو وہ باہر نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ روز بھی بڑھیا یا گھر کی دوسری عورتیں ہی جاتی تھیں۔ کسی جوان عورت کا باہر جانا کچھ ٹھیک نہیں تھا، لیکن بڑھیا کے جانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ آخر میں بڑھیا ہی گئی۔

دونوں ہاتھوں میں ایک ایک خالی بالٹی لٹکائے بڑھیا کو پچاس میٹر کی خالی ویران گلی کو پار کرنے میں پورا ایک یُگ لگا۔ بڑی مشکل سے گلی کا وہ موڑ آیا جہاں نل لگا ہوا تھا۔ موڑ کے بائیں ہاتھ پر نل تھا اور موڑ پر پہنچتے ہی دکھائی پڑتا تھا۔ نل لگتا تھا پورا کھلا ہوا ہے کیوں کہ تھوڑی دور ہی سے پانی گرنے کی آواز آنے لگی تھی۔ روز کا وقت ہوتا تو موڑ سے پہلے ہی زمین پر قطار میں رکھے بر تی دکھائی دینے لگتے اور اوجھل نل کا احساس کرانے لگتے۔ آج تو وہ جب موڑ پر پہنچی تب اس نے دیکھا ، ایک پولیس والا اپنے دونوں ہاتھوں کو چلو کی طرح بنا کر اس میں پانی روک رہا تھا اور چلو بھر نے پر اس پانی کو اپنے چہرے پر مار کر چہرہ دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

بڑھیا ایک لمحے کو ٹھشکی ، لیکن اب واپس لوٹنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتی گئی اور پولیس والے کے قریب پہنچ کر سہمی سی کھڑی ہو گئی۔ پولیس والے کی پیٹھ بڑھیا کی طرف تھی۔ جیسے ہی وہ پیچھے کو گھوما، اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ بھر گئی۔

" ارے کہاں صبح صبح آ گئی بڑھیا! جلدی پانی بھر کر بھاگ اپنے گھر ۔ ” وہ تھوڑی دور پر آگے بیٹھے ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

بڑھیا کو اتنے کم میں چھٹکارے کی امید نہیں تھی۔ وہ جلدی جلدی دونوں بالٹیاں بھر کر واپس لپکی۔ گھر کے اندر دو نوں بالٹیوں میں پانی بھرے جب وہ گھسی تو گھر کے مردوں کے بیچ وہ انتہائی غرور سے بھری تھی۔ اس نے دونوں بالٹیوں کا پانی گھر میں جتنے بھی بر تن موجود تھے ان میں بھرا اور ایک بار پھر نل پر جانے کے لیے گھر سے نکلی۔

اس بار بڑھیا کو کامیابی نہیں ہوئی۔ گھر سے تھوڑی ہی دور آگے بڑھنے پر اسے گالی گلوچ اور زمین پر ڈنڈا پٹکنے کی آواز سنائی دی۔ ہوا یہ کہ گلی میں اس کی آہٹ سن کر کئی لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازوں کھڑکیوں سے اسے پانی لینے جاتے اور پانی لے کر لوٹتے دیکھا۔ لوگوں کو لگا کہ آج اچھا موقع ہے۔ اس گلی میں زیادہ تر لوگوں کو پانی عام نل ہی سے ملتا تھا، اس لیے بڑھیا جب دوسری بار باہر نکلی تب کئی گھروں کے مرد اور عورتیں نل کی طرف پہنچ چکے تھے۔ گرمی میں پانی کی ضرورت اتنی بڑی تھی کہ گالیاں سنتے اور پٹتے ہوے بھی لوگ نل کے ارد گرد منڈلاتے رہے اور گرتے بھاگتے آدھی پونی جتنی بھی بالٹی بھری ہوتی اسے لے کر اپنے گھر میں گھستے رہے۔ بڑھیا نے چالاک بننے کی کوشش کی اور نل کے ارد گرد پھیلی افراتفری میں دونوں بالٹیاں آدھی سے زیادہ بھر لیں، لیکن واپس مڑتے وقت ایک سپاہی کی لاٹھی اس سے ایسی ٹکرائی کہ دونوں بالٹیوں کے صرف پیندے میں تھوڑا تھوڑا پانی بچا۔ اسی کو لے کر وہ واپس لوٹی۔

کمرے میں واپس گھس کر اس نے پانی نہ لا پانے کی کھسیاہٹ سعیدہ پر نکالی۔ سعیدہ جاگنے کے بعد دیوار سے لگ کر آہ و زاری کر رہی تھی۔ اس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ بڑھیا نے اپنی آواز کو پوری طرح کرخت بناکر کہا:

"ابھی تک اٹھی نہیں کرم جلی! سارا کام پڑا ہے۔ یہاں تیری لونڈی کون ہے جو سب کام نپٹائے گی ؟ اٹھ ۔۔۔جلدی اٹھ۔۔"

سعیدہ شروع ہی سے اس سے ڈرتی تھی۔ اس کی ڈانٹ کا اثر یہ ہوا کہ جب تک بڑھیا اندر بالٹی رکھ کر کمرے میں واپس لوٹی تب تک وہ سیدھی کھڑی ہو گئی تھی۔ بڑھیا کا بڑ بڑانا جاری رہا لیکن سعیدہ نے اسے موقع نہیں دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

جب تک سعیدہ واپس آئی اس کی ساس نے کافی حد تک تیاریاں پوری کر لی تھیں۔ اس وقت وہ پرانی دھلی ہوئی سفید چادر کو سوئی دھاگا لے کر سینے میں لگی تھی۔ غنیمت تھا کہ کئی بکسوں کو ٹٹولنے کے بعد یہ ایک چادر اسے مل گئی تھی جسے وہ کفن بنانے میں لگی ہوئی تھی۔ سعیدہ نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کی مدد کرنے کی کوشش کی لیکن چادر کو چھوتے ہی رُلائی سے اس کا گلا بھنچ گیا اور آنکھوں کی پتلیوں پر پانی کی بوندیں پھیل گئیں۔ ہر چیز دھندلی سی ہو گئی۔ ساس نے نرمی سے اس کا ہاتھ الگ کر دیا اور اس کے اشارے پر اس کی نند نے سعیدہ کو اپنی بانہوں میں بھرکر پیچھے دیوار پر سرٹکائے پورے سانحے سے سکتے میں پڑگئی۔

تقریباً ایک گھنٹے میں تیاری پوری ہوئی۔ بچی کو نہلا کر کفن پہنا کر چلنے کی باری آئی تو دن پوری طرح نکل آیا تھا۔ نماز پڑھی گئی اور تین مردوں کے نکلنے کے لیے دروازہ کھولا گیا۔ تب تک سعیدہ پست اور آدھ موئی سی ہو چکی تھی، لیکن دروازہ کھلتے ہی وہ پچھاڑ کھا کر گری اور پوری طاقت سے آہ و زاری کرتے ہوے اس نے دو تین بار اپنا سر زمین پر پٹکا۔ اس کے شوہر کے ہاتھوں پر بچی کی لاش تھی۔ جیسے ہی اس کا پہلا پیر گھر سے باہر نکلا، سعیدہ دروازے کی طرف جھپٹی ۔ نہ جانے اس کے ناتواں بدن میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ اسے سنبھالتے سنبھالتے اس کی ساس اور نند گر پڑیں۔

دروازے کی چوکھٹ پر ایک پیر باہر گلی میں لٹکائے اور ایک پیر موڑ کر اندر کمرے میں ڈالے سعیدہ اپنی ساس اور نند کے ساتھ دیر تک روتی رہی۔ سر جھکائے چھوٹی سی لاش کو ہاتھوں پر اٹھائے تین مردوں کی صورتیں دن کے اجالے میں غائب ہو گئیں۔ اڑوس پڑوس کی کھڑکیاں آدھی پوری کھلیں اور پھر تیزی کے ساتھ بند ہو گئیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے پلوں کے سوراخوں سے آنکھیں سٹائے نہ جانے کتنے سر ان پر ٹکے تھے۔

صبح کے سات بجے تھے اور دھوپ پوری شدت کے ساتھ چمک رہی تھی۔ چوں کہ بیتی رات بہت تھکا دینے والی اور گھماگھمی سے بھر پور تھی، اس لیے اتنا تو گارنٹی سے کہا جا سکتا ہے کہ

ابھی تک حاجی بدرالدین اور رام کرشن جیسوال کا ناشتہ میزوں پر نہیں لگا ہو گا اور اعلیٰ حکام کے غسل کے لیے رکھا ہوا پانی بھی غسل خانوں میں انتظار ہی کر رہا ہو گا۔

ادے پر کاش

ہندی کے معروف ادیب اور شاعر ادے پر کاش ۱۹۵۲ میں چھتیس گڑھ آنچل کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی۔ آج کل ٹائمز آف انڈیا پہلی کیشنز کے ہندی رسالے ”دنمان “ کے ادارتی عملے میں شامل ہیں۔ انھیں ۱۹۸۱ میں نظم "تبت" پر بھارت بھوشن اگروال ایوارڈ اور کہانیوں کے مجموعے "دریائی گھوڑا “ پر اوم پرکاش ایوارڈ دیا گیا۔ ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ تِرِچھ کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ نظموں کے مجموعے "سنو کاریگر “ اور "بوتر کبوتر " ہیں۔

آج کے شمارہ ۱۸ (ہندی کہانیاں ) میں اُوے پرکاش کی دو کہانیاں "رام سجیون کی پریم کہانی اور ترچھہ شائع ہو چکی ہیں ۔ علاوہ ازیں شمارہ 19 میں ان کی نظموں کا ایک انتخاب بھی پیش کیا گیا تھا۔

آئندہ صفحات میں ادے پر کاش کی ایک تازہ کہانی "اور انت میں پرارتھنا " کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ہم سہ ماہی "ذہن جدید ، نئی دہلی، کے ممنون ہیں۔ اس کہانی کا موضوع ہندوستان میں پچھلے چند برسوں میں نمایاں طور پر بڑھنے والی ہندو بنیاد پرستی کی لہر ہے۔

ادے پر کاش

مندی سے ترجمہ : حیدر جعفری سید

اور آنت میں پرارتھنا

"کرفیو لگا ہوا ہے، جو کوئی پلاٹ کی تلاش میں نکلے گا، اسے گولی مار دی جائے گی۔"

مارک ٹوین -

ڈاکٹر دنیش منوہر وا کانکر : ایک تعارف

اس کہانی کے واقعات اور کردار فرضی ہیں۔

اب اس کا کیا کیا جائے کہ ڈاکٹر و نیش منوہر وا کا نکر کسی افسانے یا ناول کے کردار نہیں ہیں۔ انھیں کسی افسانہ نگار کے تخیل نے نہیں پیدا کیا ہے۔ ڈاکٹر واکا نکر کس افسانہ نگار یا تخلیق کے ہونے یا نہ ہونے کے باوجود ہیں ۔ کچھ کچھ اس طرح جیسے ہم اور آپ ہیں ۔ کیا ہمیں ہونے کے لیے کس مصنف یا کسی تخلیق کے ہونے کی ضرورت ہے ؟

ڈاکٹر و نیش منوہر وا کا نگر کی عمر اڑتالیس برس کی ہے۔ ان کا سر گنجا ہے، جس پر وہ اپنی بیوی جیوتسنا واکا نکر کا بنائی ہوئی جالی دار سوتی ٹوپی منڈھ لیتے ہیں۔ ان کا جسم بھاری ہے۔ تھل تھل اور گول مٹول بیوی کے علاو ان کی چار بیٹیاں ہیں۔ سب ہی کا نام انھوں نے اپنی پسند سے رکھا ہے : پوجا ، اُپاسنا، پرارتھنا اور تپسیا۔

ڈاکٹر واکا نکر بہت مذہبی قسم کے شخص ہیں۔ پیشے سے وہ معالج ہیں۔ انھوں نے پُونے کے میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا ہے۔ بعد میں ایم ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ میڈیکل سائنس کے کچھ بین الاقوامی جریدوں میں ان کے تقریبا ًپندرہ تحقیقی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ مدھیہ پردیش اور اُڑیسہ کے آدی واسی علاقوں میں ناکافی اور ناقص غذا، اور آلودہ پانی کے پینے سے پیدا ہونے والے کچھ اب تک غیر واضح جلدی امراض پر انھوں نے مفصل اور اہم کام کیا ہے۔ ان کی راے میں یہ امراض مہلک ہو سکتے ہیں اور ان علاقوں کے آدی واسیوں کے لیے کینسر کی طرح ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چوں کہ یہ امراض شہری علاقوں اور غیر آدی واسیوں میں نہیں پائے جاتے اس لیے حکومت یا کوئی اور ادارہ ان پر دھیان نہیں دیتا۔

ڈاکٹر وا کا نکر نے جتنا زیادہ میڈیکل سائنس کو پڑھا ہے اور امراض پر تحقیق کی ہے اسی قدر ان کے اندر لاتعلقی ، مایوسی، روحانیت اور اپنی بے چارگی کا احساس پروان چڑھتا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میڈیکل سائنس دوسرے علوم کی طرح ہے، اسی طرح جیسے مذہب، فلسفہ، نظریات، سیاست، لسانیات یا علم کیمیا وغیرہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح کسی ملک یا معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کے سامنے علم سیاسیات کی کچھ طاقت نہیں ہے، اسی طرح میڈیکل سائنس کی بھی امراض کے سامنے کوئی طاقت نہیں ہے۔ ہر شخص کے جسم اور اس کی زندگی کی حیاتیاتی ترچھی لکیر ہوتی ہے، اسی کی سمت میں وہ بڑھتا ہے۔ کوئی بھی ڈاکٹر اس میں فیصلہ کن مداخلت نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر شخص کے جسم یازند گی میں دخل اندازی کرنے کا صرف گمان پیدا کرتا ہے۔

بقول ان کے، ڈاکٹر زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ وہ انسان کے جسم کے کسی حصے کو کاٹ کر اس کے جسم اور زندگی کو الگ کر دے۔ ڈاکٹر واکا نکر ہنستے ہیں کہ جو حصہ الگ کاٹا جاتا ہے وہ مر جاتا ہے اور احمق مریض کو دیکھو جو یہ نہیں سمجھ پاتا کہ یہ مرنے والا حصہ اس کے اپنے ہی جسم کا ایک حصہ ہے، یہ اس کے جسم کی ہی ایک موت ہے۔

اسی لیے ڈاکٹر واکا نکر سرجری کو، انسان کے جسم کے کسی مخصوص حصے کا قتل مانتے ہیں۔

ڈاکٹر وا کا نگر کے دوسرے متفرق نظریات

اڑتالیس سالہ ڈاکٹر دنیش وا کا نکر کا عقیدہ ہے کہ جس طرح کچھ مذہبی صحیفوں ، فلسفوں یا نظریات کا استعمال در اصل حکومت کاروبار یا انتظامیہ کو چلاتے رہنے کا سبب ہوتا ہے، علم الحرب، علم کیمیا، علم حیاتیات یا ٹیکنالوجی کا زیادہ تر استعمال انسانوں کو ہلاک کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ طبیعیات، الیکٹرانکس ، رفتار اور علم خلا یا مادی معاملات میں لگاتار ہونے والی تحقیقات کے نتیجے میں اب ہم زیادہ جامع، زیادہ متاثر کن اور نسبتاً آسان طریقے سے قتل کر سکتے ہیں۔ میڈیکل سائنس بھی اسی قسم کا ایک علم ہے۔ انسان کا علم آج تک قدرت کو برباد کرنے، اسے نیست و نابود کرنے ہی کے لیے استعمال ہوتا آیا ہے۔ ستم ظریفی صرف اتنی سی ہے کہ انسان بھی آخر کار کسی کیڑے، مادے ، پیر یا ندی کی طرح ایک قدرتی چیز ہی ہے۔

لیکن ڈاکٹر واکانکر ایشور کو مانتے ہیں۔ وہ کھتے ہیں کہ ایسے کسی وجود یا گمان کا قائم رہنا ضروری ہے۔ ان کی راے میں ایشور کم زور انسانوں کی بے چارگی اور بے چینی کی بازگشت ہے۔ ایشور افیم یا مارفین تو ہے لیکن اس معنی میں کہ وہ مارے جانے والے انسان کے درد اور اذیت کو کم تکلیف دہ بناتا ہے۔ ایشور ایسپرین ، سکون آور انیستھیزیا کی طرح ہے۔ ایک بھلا اور فیاض ڈاکٹر بھی آخر میں کسی لاعلاج مرض سے مرتے ہوے مریض کو سکون عطا کرتا ہے۔ انلجین ، ایکوی لبریم، کامبی پلام ، کامپوز، یا ہینڈ ریکس دراصل ایشور کی ہی گولیاں یا کیپسول ہیں۔ ایشور مریض کے کرب، اذیت، چیخ ، اور موت کو عالم بالا کی اصطلاح دے کر اس کی خوش گمانی میں اضافہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر و نیش منوہر وا کا نکر کی راے میں دنیا کے کئی نظریات، فلسفے اور مذہبی صحائف شروع شروع میں ایشور ہی کا جزو ہونے کا بھرم اور دعویٰ پیش کرتے ہیں، لیکن بعد میں جا کر پتا چلتا ہے کہ ان کا استعمال در اصل لوگوں کو مارنے کے لیے کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر وا کا نکر ہنستے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل میں بات یہ ہے کہ ایشور کو ہر شخص جانتا ہے لیکن ایشور کو شیطان میں تبدیل کر لینا بھی بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں کیوں کہ غلامی صرف شیطان ہی کی کرائی جا سکتی ہے۔ ایشور اور شیطان کے درمیان وہ اپنے لیے شیطان کو اس لیے چنُتے ہیں کہ وہ فرماں بردار ہوتا ہے، آپ کے احکام پر چلتا ہے، آپ کو خوش کرنا اور آپ کی دہائی ہوئی خواہشوں کو سہلانا جانتا ہے، جب کہ ایشور کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ آپ نے اسے چنا تو پھر اس سے آپ اپنا کام نہیں کروا سکتے بلکہ آپ کو اس کے احکام کی تعمیل کرنی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وا کا نکر مثال دیتے ہیں کہ فرض کر لیجیے کہ پہیا ایشور کے بے شمار رُوپوں میں سے ایک روپ ہے۔ اس طرح منطقی طور پر سائیکل ایک حد تک ایشور کے ہی ٹکس کی تفصیل ہے۔ لیکن اگر آپ پیسے کے اوپر سائیکل کا فریم نہ رکھ کر توپ، مارٹر یا میزائل لانچر رکھ دیں تو اب پہیا ( یعنی ایشور) شیطان کی سواری بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ پہیے سے سفر نہیں کر سکتے، صرف ہلاک کر سکتے ہیں۔ یہ ایشور کو شیطان میں بدل دینا ہے۔

ڈاکٹر واکا نکر کا کہنا ہے کہ وہ کسی بھی چیز یا خیال کو دیکھ کر دس سیکنڈ میں بتا سکتے ہیں کہ یہ ایشور کا حصہ ہے یا شیطان کی سواری ہے۔

ان کا بچپن اور جیو تسنا کی چڑھی

ڈاکٹر ونیش وا کانکر یوں تو مراٹھی ہیں لیکن اب تک وہ صرف دو ہی بار ایل ٹی اے لے کر مہاراشٹر گئے ہیں۔ ان کی بیوی کے کچھ رشتے دار مہاراشٹر میں نراین پور اور بمبئی کے آس پاس رہتے ہیں۔

ان کی ولادت ۸ دسمبر ۱۹۴۳ کو کلت پور، اتر پردیش، میں ہوئی تھی۔ والد گوالیار میں مہاراجا کے معمولی ملازم تھے۔ لیکن ہر باپ کی طرح وہ بھی عظیم تھے اور انھیں سے متاثر ہو کر لڑکے وا کا نکر نے لگاتار پڑھائی لکھائی میں من لا یا ، ویدوں، پرانوں اور اُپنشدوں کا مطالعہ کیا، امتحانات میں ہمیشہ اول آتے رہے، مباحثوں اور مضمون نگاری کے مقابلوں میں انعامات حاصل کرتے رہے۔ انہیں ذہین ، محنتی، مستقل مزاج اور نظم و نسق کا پرستار تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ اسکول میں پی ٹی کے پیریڈ میں باقاعدہ گی سے جاتے تھے۔ ان کے ناخن صفائی کے ساتھ ترشے ہوے ہوتے تھے۔

کھانے، سونے، ورزش اور مطالعے کے لیے ان کا متوازن ٹائم ٹیبل تھا۔

بچپن ہی سے وہ ایسے طالب علم تھے جس کی ہر کاپی اور کتاب ہمیشہ مجلد اور پنسل قرینے سے تراشی ہوئی رہتی تھی۔ جیومیٹری باکس میں ہر چیز پوری ہوتی تھی۔ ان کی کوئی چیز کبھی گم نہیں ، ہوئی تھی۔ ہوم ورک ہمیشہ پورا ہوتا تھا اور حاضری سب سے زیادہ۔ ان کے والد انھیں ہمیشہ اشلوک سناتے تھے: کاک چیشٹا، بکود ھیانم، شوان نارارد تتھیوچ ۔ " اسی اشلوک پر لڑکے واکا نکر نے اپنی طالب علمی کی زندگی کی بنیاد رکھی۔

لیکن رفتہ رفتہ، کچھ ہی برسوں میں، انہیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ دوسرے طلبا انھیں پسند نہیں کرتے۔ باقی عام لڑکوں کی اپنی الگ الگ دنیائیں تھیں اور ان دنیاؤں کے دروازے وا کانکر کے لیے بند تھے۔

کئی بار وہ خود کو بے حد اکیلا محسوس کرتے۔ کبھی کبھی وہ تنہائی میں رونے بھی لگتے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے اس اکیلے پن کے بارے میں سوچنا بھی شروع کیا اور جلد ہی انھیں پتا لگا کہ باقی لڑکوں نے اپنے بچپن کو کسی کھیل کی طرح پوری رفتار، آزادی اور جوش کے ساتھ اپنا یا ہے۔ وہ لڑکے اپنے بچپن کو اپنے مستقبل کی ملازمت، کریئر یا کاروبار کا ذائقہ بنانے کے لیے سڑانا نہیں چاہئے تھے۔

جلد ہی لڑکے واکا نکر کو لگنے لگا کہ دوسرے بچوں کے بچپن سے جہاں کچے امرود، تازہ کٹےکھیرے اور ابھی ابھی کسی کنویں یا ندی سے لائے گئے پانی کی مہک آتی تھی وہاں ان کا بچپن مستقبل میں، برسوں بعد بننے والی کسی چیز کے لیے سڑا یا اور گوندھا جارہا تھا۔ اس میں خمیر اٹھ رہا تھا۔ اس میں فر ینٹشن کے کیڑے رینگ رہے تھے۔ وا کا نگر کے بچپن میں پیدا ہوے خمیر کے کیڑوں کو دیکھ کر ان کے والد اور دوسرے بزرگ بہت خوش ہوتے تھے۔

واکانکر کے بچپن میں پیدا ہوے خمیرے کےکیڑوں کو دیکھ کر ان کے والد اور دوسرے بزرگ بہت خوش ہوتے تھے؛ وہ انھیں مبارکباد دیتے اور ایک دوسرے سے ان کے ہونہار ہونے کی بات کرتے۔

لڑکا وکانکر دوسرے لڑکوں کے سامنے اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگا۔ ان لڑکوں کے پاس بچپن کے جوکھم اور جوش بھرے، تمام رنگوں اور شکلوں کے تجربوں کے ڈھیر تھے۔ وہ ایسی ڈھیریاں اکٹھی کرتے، آپس میں ایک دوسرے پر بالُو یا پانی کی طرح اچھالتے، آپس میں انھیں باٹتے؛ کسی ڈھیر سے نکلی کسی چمکدار چیز کے لیے ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کرنے، چیختے چلاتے اور بالک واکا نکر اس دنیا کے بند دروازے کے باہر کھڑے چپ چاپ دیکھتے رہتے۔ امتحانات میں اچھے نمبر لے آنے کے باوجود انہیں لگتا کہ وہ دوسرے لڑکوں کے سامنے کمتر محروم اور بیمار ہیں۔

ایک لڑکا تھا، زمین پرتاپ سنگھ۔ وہ پاس ہی کے کسی رجواڑے کے گھرانے کا لڑکا تھا۔ فٹ بال اور بیڈ منٹن بہت اچھا کھیلتا تھا۔ اسے گھڑ سواری بھی آتی تھی اور لڑکے بتاتے تھے کہ بندوق کی نشانہ بازی میں وہ کرشمے دکھاتا ہے۔ نتن کی حاضری اسکول میں سب سے کم ہوتی تھی۔ کاپی کے صفحات پھاڑ کر وہ ہوائی جہاز، ٹوپی یا کاغذ کے غبارے بنا یا کرتا تھا۔ اس کے گھر کے لوگ رئیس تھے اور وہ دو تین بار ہانگ کانگ اور سنگا پور ہوآیا تھا۔

نتن پرتاپ سنگھ لڑکیاں پٹانے میں بھی استاد تھا۔ لڑکیاں اس سے خوش رہتی تھیں۔ وہ سب سے زیادہ اسی کے ساتھ رہتی تھیں۔ لیکن لڑکے اور استاد اس سے ناراض رہتے تھے۔ سنسکرت کے ٹیچر شیر ی کرشن پرین شاستری کہتے تھے کہ نتن بر باد طالب علم ہے؛ طالب علمانہ زندگی تو گُرو کلُ میں عقیدت سے گزارے ہوے کچھ برسوں کے حصول علم کا نام ہے۔

سائنس پڑھانے والے بنگالی ٹیچر سنیل شاکرتا، جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ کمیونسٹ ہیں اور روس کے ایجنٹ ہیں، نتن کے بارے میں ان کے خیالات بھی کچھ اچھے نہیں تھے۔ ان کی راے میں نتن زمیندار گھرانے کا زوال پذیر نمائندہ تھا؛ وہ لڑکیوں کو سرمایہ دارانہ نظروں سے دیکھتا تھا۔

ڈاکٹر ونیش منوہر واکا نکر کے بچپن کے سات دن ، جب وہ نتن پرتاپ سنگھ کے ساتھ اس کے گاؤں گئے تھے، ان کی زندگی کے لیے بہت اہم اور تبد یلی لانے والے ثابت ہوے۔ نتن کے ساتھ انھیں پہلی بار محسوس ہوا کہ فطرت کی طرح انسان کی زندگی کے بھی کچھ اندرونی قانون ہوتے ہیں۔ ان قوانین کی اپنی رفتار ہوتی ہے جسے کسی بھی چیز سے کنٹرول کرنے، روکنے یا خراب کرنے سے ایک ایسے انسان کی تعمیر ہوتی ہے جو حکومت یا معاشرے کے لیے مفید سانچے میں تو ڈھلا ہوتا ہے لیکن وہ انسان بہت فطری نارمل اور عملی نہیں ہوتا۔

متن پرتاپ سنگھ کے گاؤں اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں میں واکا نکر کو کئی ایسے فطری اور عملی لڑکوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ان لڑکوں کے پاس کوئی ٹائم ٹیبل نہیں تھا۔ گاؤں میں گھڑیاں بہت کم تھیں۔ کوئی دفتر نہیں تھا۔ البتہ اسکول ضرور تھا جس میں بیشتر بچے نہیں جاتے تھے۔ وقت وہاں ندی کی طرح پورے پھیلاو اور سنجید گی کے ساتھ دھیمی رفتار سے بہتا تھا۔

ڈاکٹر واکا نکر شہر ہی میں پلے بڑھے تھے۔ گاؤں کا یہ تجربہ ان کی یادداشت کی گہرائی میں کہیں ثبت ہو گیا تھا۔ نتن پرتاپ سنگھ سے ان کی دوستی گہری ہوتی گئی تھی۔

نتن نے واکا ٹکر کے بچپن میں کچھ انوکھے اور مستقل تجربوں کا اضافہ کیا تھا۔ اس نے ایک بار اسکول کے پرنسپل بی ڈی سریواستو کی گیارھویں میں پڑھنے والی لڑکی پسپا سر یواستو کی فراک اٹھا کر اس کی جانگھیں دکھائی تھیں۔ چپا کے سفید ، شکن آلود، تھوڑے سے مٹ میلے جانگھیے کی سلوٹیں لڑکے واکا نکر کی اب تک کی زندگی کی چٹان کے اندر کسی بارود کی طرح دھماکا خیز ثابت ہوئیں۔ وہ حالاں کہ گیارھویں کے بورڈ کے امتحان میں امتیازی نمبر لے کر فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوے، لیکن اب دوسرے لڑکوں کی خراب دنیاؤں کی کھڑکیاں اور دروازے ان کے لیے کھلنے لگے تھے۔ وہاں مٹر کی پھیلیاں تھیں ، چاکلیٹ تھے، بالغوں کے لیے پڑھے جانے والے ناول تھے، عور توں کی ننگی تصویریں تھیں۔ وہاں سنیما ہال تھے، لڑکیاں تھیں اور کئی پوشیدہ کھیل تھے۔ چُھرےبھا لے اور پستول بھی تھے۔

کچھ معاملات کو چھوڑ کر، مجموعی طور پر یہ ایک پاک صاف، بے لوث، پُر تجنس ، پُرجوش اور پر اسرار بچپن تھا۔ وہاں کوئی بھی لڑکا اپنے آنے والے مستقبل میں موجود کسی کرسی یا خزانے کے بے رنگین تتلیوں یا ننھے ننھے خرگوشوں کی جستجو نہیں کرتا تھا۔ وہاں کا ایک الگ دستور تھا۔ اس ممنوعہ دنیا کے باشندے لڑکوں کے سر پرست اور والدین، ان لڑکوں کے مستقبل کی فکر میں مبتلاء آپس میں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے، لیکن آنے والے وقت کے عدم تحفظ اور اندیشوں کے خطرات سے بے خبر یہ لڑکے یوں ہی بڑے ہور ہے تھے۔ لڑکے واکا نکر ، جواب جوان ہو چکے تھے ، ان دونوں دنیاؤں کے شہری ہو ر ہے تھے۔

وہ اب مسکراتے ہوے بتاتے ہیں کہ اس دنیا کے زیادہ تر لڑ کے زیادہ کامیاب ہوے ہیں۔ نتن پرتاپ سنگھ صوبائی وزیر رہ چکا ہے۔ کئی دوسرے لڑکے کاروبار اور جرائم وغیرہ دوسرے سماجی پیشوں میں نکل گئے۔ سب کے پاس زر، زمین ہے۔

ان کی بیوی جیو تسنا ضرور آج تک یہ نہیں جان پائیں کہ ڈاکٹر وا کا نکر کئی بار انہیں فراک اور سفید مٹ میلا، شکن آلود جانگھیا پہننے کے لیے کیوں کہتے ہیں۔

حد ہے کہ اس عمر میں بھی۔

اعلی تعلیم ، ملازمت اور شخصیت کی تعمیر

کالج میں بی ایس سی فرسٹ ایئر کرنے کے بعد ڈاکٹر وا کا نکر پری میڈیکل ٹیسٹ (پی ایم ٹی ) میں شامل ہوے اور میرٹ میں پوزیشن حاصل کرنے کے ساتھ ہی ان کا داخلہ پونا میڈیکل کالج میں ہو گیا؛ کسی سفارش یا رشوت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ والد اور خاندان والے ان سے خوش تھے ، حالاں کہ واکا نکر کی زند گی پہلے سے کافی بدلی ہوئی تھی۔

واکا نکر اب" اے " سر ٹیفکیٹ والی فلمیں بھی دیکھتے تھے۔ لڑکیوں سے بات چیت کرنے میں اب انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی، لیکن شرم وحیا نے کبھی آگے بڑھنے نہیں دیا۔

کئی بار خواہش ہوئی کہ والد سے کہہ کر اپنے لیے ایک اسکوٹر خرید لیں اور لڑکیوں کو پیچھے بٹھا کر گھومیں ، لیکن انھیں گھر کی معاشی حالت کے بارے میں مکمل واقفیت تھی لہذا وہ ایسا نہیں کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ لیبارٹری میں ڈائی سیکشن کے لیے کس لڑکی کی ہیلپ کر کے، کسی کو اپنے نوٹس اور کتابیں دے کر، یا کبھی کبار کسی لڑکی کی فرمائش پر اس کےٹفن سے پراٹھا اور سبزی کھا کر ہی وہ خوش اور رومانٹک ہو لیا کرتے تھے۔ ایم بی بی ایس میں اپنے سے دو سال سینیئر شویتا گھوڑیکر کے ساتھ فینٹسی میں وہ کئی بار مسوری میں ہنی مون منا چکے تھے ؛ اُس کی برا کا ہک کھول چکے تھے؛ سفید مٹ میلے، اور شکن آلود جانگھیے میں اسے اپنے کمرے میں گھنٹوں بٹھا چکے تھے۔ لیکن جلد ہی شویتا گھوڑیکر نے اپنے سِکھ ہوائے فرینڈ کے ساتھ شادی کر لی اور واکا نکر کے سپنوں کے سامنے راستا بند ، کام چالو ہے "کا بورڈ لگ گیا۔

وا کا نگر کی دلی خواہش تھی کہ وہ میڈیکل کالج ہی میں مستقبل میں ڈاکٹر بن جانے والی اپنی کسی کلاس فیلو یا جو نیئر سے شادی کر لیں ، لیکن آخر کار شادی ان کے والد اور خاندان والوں کی مرضی سے اندور کی ہوم سائنس میں گریجویٹ جیوتسنا نامی لڑکی سے ہوئی جو ہارمونیم پر کچھ فلمی گانوں اور بھجنوں کو گا بجالیتی تھی۔ وہی جیو تسنا اب ان کی بیوی ہے۔

ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں پہنچنے کے دوران ہی واکانکر کی فکریں کچھ گہری ہونے لگیں۔ اس دوران انھوں نے بودھ دھرم، مارکسزم ، گاندھی اور تلک کی کتابیں پڑھیں۔ سوامی کر یا تری ، دین دیال سرسوتی اور دین دیال اپادھیائے کی کتابیں بھی ان کے ہاتھ لگ گئیں۔ وا کانکر کو تعلیم کے بعد کی زندگی مدھیہ پردیش ہی میں گزارنا پڑی، لیکن مراٹھی نسل کے بنیادی سنکاروں کی وجہ سے کسی اور کے مقابلے میں انہیں ویر ساوَر کی تلک، گولوالکر، اور ہیڈ گے ور کے نظریات نے زیادہ متاثر کیا۔ اسی مراٹھی نسل کے غرور کو انھوں نے قومی جذ بہ کہنا شروع کیا اور چھترپتی شواجی ان کے ہیرو بنے۔

یہی دور تھا جب وہ رفتہ رفتہ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ ( آر ایس ایس) کی شاکھا میں باقاعد گی سے جانے لگے۔

۱۹۶۵-۲۶ میں کھر گون کے ایک پسماندہ علاقے میں ابتدائی صحت کے سرکاری مرکز میں ان کا تقرر ہو گیا۔ تب سے وہ سرکاری ڈاکٹر ہی رہے۔

اپنی سرکاری ملازمت کے دوران وہ راشٹر یہ سویم سیوک سنگھ میں مسلسل سر گرم رہے۔ وہ جس علاقے میں ڈاکٹر بن کر جاتے وہاں کے نوجوانوں کو اس سنگھٹن میں آنے اور قومی خدمت کرنے کے لیے اکساتے۔ وہ انھیں سمجھاتے کہ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں یہودیوں کے علاوہ سب سے زیادہ علم ہندوؤں ہی پر ہوا ہے۔ اس قوم کو مٹانے کے لیے دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں متحد رہی ہیں۔ یہودیوں کو تو پھر بھی اپنا ایک ملک اسرائیل مل چکا ہے لیکن ہندوؤں کے پاس اپنا کوئی ملک نہیں ہے۔ دوسروں کی غلامی اور چاکری ان کا مقدر رہی ہے۔ ۱۹۴۷ میں قوموں کے نام پر ملک کو تقسیم کرنے والے لوگ اقتدار پر قابض رہنے کے لیے ہندوؤں کو آپس میں لڑاتے رہے ہیں ، اور آج تک اپنے ملک میں ان کی حالت مہاجروں کی سی ہے۔

بیداری نو کے لیے جد وجہد

ڈاکٹر و نیش منوہر وا کانکر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، ہندوؤں کی بیداری نو کے لیے لگاتار کام کرتے رہے۔ وہ ڈاکٹری کے پیشے اور سنگھ کے لیے ہمیشہ ایماندار، وفادار اور عقیدت مند رہے ۔ وہ کبھی کسی مریض سے ذاتی فیس نہیں لیتے تھے۔ دوسرے سرکاری ڈاکٹر مرکز صحت میں آنے والے مریضوں کو ٹال کر انہیں شام کو اپنے گھر پر آنے کے لیے کہتے تھے اور بعد میں اپنی پرائیویٹ فیس وصول کرتے تھے۔ جبکہ ڈاکٹر وا کانکر پوری لگن اور ذمے داری کے ساتھ بے لوث جذبے سے مریضوں کی دیکھ بھال اور علاج کرتے تھے۔ سرکاری ملازمت کے قوانین میں واضح حکم تها کہ سر کاری معالج کو پرائیویٹ پریکٹس نہیں کرنی چاہیے، لہذا ڈاکٹر وا کانکر دوسرے ڈاکٹروں کے کام کو غیر اخلاقی اور غیر قانونی مانتے تھے۔

کئی بار ان کی بیوی جیوتسنا واکا نکر، ان کے کچھ دوست اور عزیز رشتے دار سمجھاتے کہ زمانہ بہت تیزی سے بدل رہا ہے، دوسرے ڈاکٹروں کی طرح انھیں بھی پریکٹیکل اور دنیادار بننا چاہیے۔ لیکن ڈاکٹر وا کانگر سختی کے ساتھ سرکاری ملازمت میں پرائیویٹ فیس لینے، پرائیویٹ پریکٹس کرنے اور بالائی آمد فی بٹورنے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان کے لیے یہ قانون اور اخلاق دونوں کے خلاف تھا۔

دوسرے ڈاکٹروں کی شہر یا قصبے میں میڈیکل اسٹورز والوں یا دواساز کمپنیوں کے سیلز ایجنٹوں کے ساتھ ساتھ گانٹھ تھی۔ وہ ڈاکٹر سرکاری ہسپتال میں سبسڈی کے ساتھ یا مفت آنے والی سر کاری دواؤں کو سستے داموں کیمسٹوں کو بیچ دیتے تھے۔ ہسپتال آنے والے مریضوں کو علاج کے لیے اپنی جیب سے پیسا لگا کر وہی دوائیں دکانوں سے اونچے بھاؤ میں خریدنی پڑتیں۔ کئی ڈاکٹروں کو تو ہر مہینے سرکاری تنخواہ کے علاوہ کیمسٹوں اور دوا بنانے والی کچھ کمپنیوں سے ماہانہ بھتا بھی ملتا تھا۔ یہ ڈاکٹر مریضوں کو "خاص" دوکانوں یا "خاص" کمپنیوں کی "خاص" دوائیں خریدنے کے لیے مجبور کرتے تھے۔

صوبے کے پس ماندہ دیہی علاقوں میں تو حالت اور بھی عجیب و غریب تھی۔ وہاں کئی پی ایچ سی ( پرائمری ہیلتھ سینٹرز) ایسے تھے جہاں تعینات ہونے والا ڈاکٹر مہینوں نہیں جاتا تھا۔ اوپر کے افسروں کو پٹا کر وہ اپنی تنخواہ لیتا رہتا اور آرام سے اپنے شہر میں پریکٹس کرتا رہتا۔ کئی ڈاکٹر ایسے بھی تھے جو ریسرچ" کے نام پر تنخواہ اور وظیفے کے ساتھ چھٹی لے لیتے تھے اور اس درمیان یا تو اپنا تبادلہ اپنی پسندیدہ جگہ پر کرا لیتے تھے یا کسی بڑے شہر کے پرائیویٹ پولی کلینک میں اچھی تنخواہ پر لگ جاتے تھے۔ کئی دبئی، کویت و غیره خلیجی ممالک کی جانب پیسا کمانے چلے جاتے تھے۔

ڈاکٹر دنیش منوہر واکانکر کو بھی ان کے خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ وہ آئیڈیلسٹ نہ بنیں ، اپنی سرکاری ملازمت سے فائدہ اٹھائیں اور اس درمیان گوالیار یاللت پور میں اپنی بیوی کے نام سے کوئی نرسنگ ہوم کھول لیں؛ ان کے جیسے شریعت اور ایماندار کے لیے سرمایہ کاری کرنے والے بہت سے مل جائیں گے۔ لیکن ڈاکٹر وا کا نکر اس کے مخالفت تھے۔

انھوں نے وی شانتارام کی فلم ' ڈاکٹر کو ئنٹس کی امر کہانی "دیکھ رکھی تھی۔

معاشرتی علیحد گی

کیا یہ اور واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ سرکاری ملازمت میں ڈاکٹر واکانکر ایک مسئلہ بن گئے تھے؟ ان کی وجہ سے دوسرے ڈاکٹروں ہی کو نہیں، پورے محکمہ صحت کو دقت ہوتی تھی۔ آخر کیا نہیں تھا وہاں ؟ پیسا تھا، عزت تھی، بالائی آمد فی تھی، کلب تھے، نرسیں تھیں۔ ایک دو ڈاکٹروں نے ڈاکٹر وا کانکر کو سدھارنے کی کوشش بھی کی۔ انھیں کلب لے گئے، محفل مے نوشی میں شامل کیا، ایک چالُوو نرس کو ان کے ساتھ صوفے پر بٹھا کر باہر چلے گئے، لیکن ڈاکٹر وا کا نکر کا بھاری ساسر، سنجید گی اور اندیشے سے دھیرے دھیرے کا نپتا ہوا، شراب کے نشے میں فلسفی ہوتا چلا گیا۔

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ جس ہسپتال میں ڈاکٹر وا کانکر کی پوسٹنگ تھی وہاں کے انچارج سینئر ڈاکٹر نے کسی گھٹیا کمپنی کی نقلی سپلائی کی بوتلیں اور کچھ انجکشن خریدے۔ ڈاکٹر وا کا نکر نے یہ کہتے ہوے اس خریداری کی مخالفت کی کہ آپ لوگ دافع درد دواؤں تک تو ایسی عیاری مکاری کر لیں ، لیکن براہ کرم کسی انسان کی نسوں کے اندر داخل کی جانے والے انٹر وینس انجکشن کے ساتھ موت کا ایسا کھیل نہ کھیلیں ؛ ایسی حالت میں مریض دیکھتے دیکھتے مر سکتا ہے۔ ان کی اس مخالفت کے بعد تمام ہسپتال میں ان کا بائیکاٹ کیا جانے لگا۔ حالاں کہ وہاں ان کی تائید کرنے والے تعداد میں زیادہ تھے لیکن ڈاکٹر وا کا نکر کے بارے میں یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ وہ خواہ مخواہ کے اڑنگے باز، دندی، پهندی ، سنکی اور پگلیٹ قسم کے انسان ہیں۔

ڈاکٹر واکا نکر کو دوسرے سرکاری افسران اور ڈاکٹر اپنے گھر میں یا نائٹ پارٹیوں میں نہیں بلائے تھے۔ وہ پھر اکیلے رہ گئے تھے، سب سے الگ تھلگ۔ انھوں نے ڈائری لکھنے کی عادت ڈالی۔

لیکن وہ دوسری سطح پر سب سے زیادہ مصروف بھی تھے۔ وہ لگاتار اپنے پیشے اور مریضوں کی خدمت میں لگے رہے۔ ایسا ہونا فطری بات تھی کہ وہ اپنے علاقے میں ہر دل عزیز ہو جاتے، اور ایسا ہوا بھی۔ وہ چوں کہ امراض اور مریضوں کے بارے میں سنجیدہ تھے، میڈیکل سائنس کی نئی کتابیں اور ریسرچ جرنلز پڑھتے رہتے تھے، اور مریض کی حیثیت، حالت اور مرض کی حالت دیکھ کر دوائیں دیتے تھے، ان کا علاج موثر ثابت ہوتا تھا۔ ہسپتال آنے والے زیادہ تر مریض اصرار کرتے کہ انھیں ڈاکٹر وا کا نکر سے اپنا علاج کرانے دیا جائے۔

ایسی حالت میں ہسپتال اور محکمہ صحت میں ان کے خلاف حسد اور مخالفت کا جذ بہ اور گہری جڑیں جما نے لگا۔

ڈاکٹر وا کا نکر نے اپنے پیشے سے دوسرے لوگوں سے اپنی علیحد گی کو پیش نظر رکھ کر اپنی ڈائری کے ایک صفحے پر لکھا:

میں شدید تنہائی محسوس کرتا ہوں۔ رفقا کھتے ہیں میں پریکٹیکل نہیں ہوں ، میں آدرش وادی ہوں۔ لیکن در حقیقت مجھے اپنے کام کاج میں کہیں آئیڈیلزم نظر نہیں آتا۔ میں صرف یہ کر رہا ہوں کہ زندہ اور بے قصور لوگوں کو نقلی اور مہلک دوائیں نہیں دے رہا ہوں ، سرکاری ملازمت میں رہتے ہوے لوگوں سے پرائیوٹ فیس نہیں وصول رہا ہوں اور دل لگا کر اپنی ڈیوٹی کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ انھوں نے آخر میں ایک سوال بھی لکھ دیا تھا :

میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ کیا جو بے ایمان نہیں ہے وہ پریکٹیکل نہیں ہو سکتا ؟"

ہروَنش پنڈت عرف تُھکر امہاراج سے ملاقات

ڈاکٹر ونیش منوہر وا کانکر نے اپنی تنہائی کا خلا پر کرنے کے لیے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی شاکھا میں اپنی سر گرمی میں اور اضافہ کر دیا۔ وہ سنگھٹن کے کام میں لگ گئے۔ ان کے علاج میں فیس نہ لینے، مریضوں سے اپنائیت اور مخلصانہ برتاو اور حسن اخلاق سے متاثر ہو کر کئی افراد اور خاندان شاکھا میں آنے لگے۔ سنگھ کے نینا اور عہدے دار رفتہ رفتہ ان کے کارناموں سے واقف اور متاثر ہونے لگے اور انہیں سنگھ کے مخلص اور ایثار پسند کار کن کے طور پر جاننے لگے۔

و دهان پور نامی جس چھوٹے سے قصبے کے صوبائی مرکز صحت میں ڈاکٹر واکا نکر کا تقرر تھا، وہاں سے تقریباً آٹھ کلومیٹر دور ایک چھوٹی سی ندی باہنی کے پار دیر پور نامی گاؤں میں ہیرونش پنڈت کا گھر تھا۔

ہرونش پنڈت کو بیشتر لوگ اس نام سے نہیں جانتے تھے بلکہ وہ تھکرا مہاراج “ کے نام سے یہ یا بانچتے توان سے معروف تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ہرونش پنڈت جب بولتے تھے یا کتھا پانچتے تھے تو ان کے منہ سے تھوک نکلتا تھا۔ وہ ذات سے برہمن تھے، کل سے دوبے، یعنی دویدی، اور گو تر سے بھاردواج تھے۔

تھکرا مہاراج غریب برہمن تھے۔ صرف پانچ سات ڈسمل زمین تھی جس سے پنڈتائن ساگ باجی اور اساڑھے ساون میں کھیرا ٹھٹا بولیتی تھیں۔ گھر کا زیادہ تر خرچ پنڈتائی اور ججمانی سے چلا کرتا تھا۔ کئی منتوں ، سونے کے کشتے کھانے اور شدید محنت و مشقت کے بعد پنڈت پنڈ نائن کو ایک ہی اولاد نرینہ نصیب ہوئی تھی۔ لڑکے کا نام ٹھکرا مہاراج نے پنڈت بھولا شنکر دویدی رکھا تھا، لیکن گاؤں کے لڑکے انھیں کیدھا مہاراج " کے نام سے جانتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ بھولا شنکر کا کیدا . (پیٹ) بہت بڑا اور تربوز کی طرح پھولا ہوا رہتا تھا۔

پیج 138

برونش پنڈت پچھلے کچھ برسوں سے بھیانک معاشی تنگ دستی سے گزر رہے تھے۔ اونچی ذات کے لوگوں میں پوجا پاٹھ، کتھا کبیر تن ، دھرم کرم میں دل چسپی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ پنڈت جی نے شاستروں میں پڑھ رکھا تھا کہ ہندوؤں میں چتری، برہمن اور ویش ہی دوبارہ جنم لینے والی ذاتیں ہیں، اور پروہت کا کام برہمن کو انہیں ذاتوں کے لیے کرنا چاہیے۔ شاستروں میں شودروں کے لیے یگ، جون ، اور جنیو سنکار و شیر و ممنوع تھے۔ لیکن ممنوع تو بہت سی چیزیں تھیں، تھکرا مہاراج

و بھوئی نمادین برائے

درمیان جو فحش قسم کے مذاق چل رہے تھے، انھوں نے انہیں اور غم زدہ کر دیا۔ راجدھانی سے چہار و اخبار نویسوں کا ایک گروہ آیا تھا جو اپنی پوشاک اور کیمروں کی وجہ سے الگ پہچانا جا رہا تھا۔ اپنے کو - مقامی صحافیوں سے زیادہ معزز مانتے ہوے، یہ گروہ الگ کھڑا تھا۔ منشی جی بجھے دل سے اس گروہ کے پاس چلے گئے۔

امنشی جی ، اٹ از باریسبل! اتنی بڑی ٹریجڈی اس شہر میں رونما ہو چکی ہے، پھر بھی ان جر نلسٹوں کے احساس خودداری کو کیا ہو گیا ہے؟ کیسے بے شرم ہو کر ہنس رہے ہیں۔" منشی بر پرشاد نے آنکھیں سکیڑ کر جینز دھاری لڑکی کو بولتے ہوے سنا۔ انھیں لا کہ انھیں قے ہو جائے گی۔ آج یہ لڑکے لڑکیاں ان کے ساتھ گھومتے رہے تھے۔ جلے ہوے مکان یا ان کے ملبے میں دبے کنگالوں کو دیکھ کر انگریزی میں اپنی تکلیف بیان کرنے والے ان لوگوں نے تیز دھوپ ہو جانے پر انفارمیشن افسر کی جیپ سے کریٹ اتروا کر ایک آدھ جلے مکان کے بر آمدے میں بیٹھ کر پلٹ بیئر کی تھی۔ منشی ہی ڈرائیور کی بغل میں بیٹھے تھے سے ہارن بجاتے رہے تھے۔ اب

اس لڑکی کو دوسرے بے شرم اور بے حس لگ رہے تھے۔ کامریڈ سورج بھان منشی جی کی دلی حالت بھانپ گئے۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے ان کے دوست تھے۔ یہ بات انھیں اچھی طرح معلوم تھی کہ منشی سر پرشاد صرف قلم گھسیٹ صحافی نہیں تھے؛ خبر میں انہیں متاثر کرتی تھیں اور اکثر خبریں جمع کرتے کرتے وہ ان کا حصہ بن جاتے تھے۔ انھوں نے قریب جا کر ملائمت سے منشی جی کا ہاتھ پکڑا اور انھیں ایک دوسرے کونے کی طرف لے

بر آمدے کے ایک طرف زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے پر لوگوں کا دھیان ادھر منتقل ہو گیا۔ کھیم چند جنگل کشور نامی شرم کے مالک اللہ داد سے لال چڑائے جانے پر کسی زخمی ناگ کی طرح پھنکار رہے تھے:

ٹھیک ہے، فساد میں اناج کی قیمتیں بڑھیں گی تو میرا فائدہ ہو جائے گا، لیکن فائدہ کے کاٹتا ہے ؟ میں اتنا گناہگار نہیں ہوں کہ اپنی بکری بڑھانے کے لیے خود فساد کرا دوں۔ آپ تو شرابی، یہ بھی کرا سکتے ہیں۔ آپ کو پاکستان اور مسلم لیگ کے جھنڈے میں فرق نہیں معلوم ہے۔ خلد آباد کی مسجد کی بغل میں مسلم لیگ کا دفتر ہے۔ پھر بھی آپ نے مسلم لیگ کے دفتر پر

و بھوتی نراین رائے

ادے پر کاش

سب کی تعمیل کرتے تو بھوکوں مر جاتے۔ علاقے کے ٹھاکروں اور بنیوں میں نیا فیشن آ گیا تھا۔ ان کے یہاں جمانی ہی نہیں بلکہ اگر اسن، کتھا یو جن کا کام ہی بہت کم ہو گیا تھا۔ کوئی سنسکار وغیرہ ہوتا تو شہر سے بچاتا ہوا پڑھالکھا پنڈت بلایا جاتا۔ اسی لیے ٹھکرا مہاراج نے مجبوری میں کیے جانے والے ممنوعہ کام کے طور پر پنڈتائی اور جمانی کے کام میں اونچی ذات نیچ ذات کا خیال کرنا بند کر دیا۔ ان دنوں وہ اکثر یہ کھتے ہوے سے جانے لگے کہ ذاتیں جنم سے نہیں بلکہ کرم سے ہوتی ہیں، جیسا کام ویسی ذات۔ ضلعے میں کئی کانیں تھیں، نیچ ذات کے بہت سے لوگ روز کی مزدوری کر رہے تھے اور ڈھائی ہزار روپے ماہانہ تک کمار ہے تھے۔ وہ تھکرا مہاراج کے نئے مہمان بنے اور اونچی ذاتوں میں ٹکرا مہاراج کے بارے میں مشہور ہونے کا کہ یہ اللہی اور بھوکا بنگالی برہمن آج کل تیلی تنبولی، چہار ڈھیروں کو جیتو پہناتا

گھوم رہا ہے۔ انہیں دنوں ڈاکٹر واکا نگر سے ہرونش پنڈت عرف ٹھکرا مہاراج کی ملاقات ہوئی اور وہ باقاعدگی سے سنگھ کی شاکھا میں آنے لگے۔ وہاں ” بھائی جی لوگ ” اور ” قابل احترام بھائیوں کے پروٹین کے علاوہ لاٹھی ڈنڈا چلانا ، لیزم ورزش وغیرہ کے پروگرام بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک بار ایک بھائی ہی بھوپال سے آئے تھے اور انھوں نے کہا تھا کہ جواہر لال جی کے نہ رہ جانے اور سوتنتر پارٹی کے ختم ہو جانے سے ہندوستانی سیاست کی بنیادوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اسے پر کرنے کے لیے جو بگولا ملک کی سیاست میں پیدا ہو گا اس میں سب سے تیز رفتار اور ہمہ گیر بگولا "ہندو وادی" سیاست کا ہو گا؛ سنگھ اقتدار میں آئے گا اور پھر اب تک دبائے گئے ہندوؤں کی شان و شوکت دوبارہ قائم ہو گی۔ شکر امہاراج نے اس شام ڈاکٹر وا کا نگر سے علیحد گی میں پوچھا تھا۔ ان کی آواز نئے اور جوش

سے تھر تھرارہی تھی۔ انھوں نے کہا تھا:

ڈاکٹر صاحب! اگر ایسا ہوا تو میرا دل کہتا ہے کہ گاؤں گاؤں ایک بار پھر بیگ، ہوں ہونے

لگیں گے۔ مونڈن ، کان چھیدن، جنید کی رسم جیسے سنسکار پھر سے رائج ہوں گے۔ گئو ہڈیا پر پابندی

لگ جانے سے گھی دودھ کی ندیاں بنے لگیں گی۔ برہمی کھیر کھائیں گے، شودر خدمت کریں گے۔

آپ کی کیا راے ہے؟"

اور انت میں پرارتھنا

۲۷۵

ڈاکٹر وا کانکر نے برونش پنڈت کے یقین کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ وہ سیاسی افق پر خود ہی اس کے آثار دیکھ رہے تھے۔ ہندو مفاد، اکھنڈ بھارت اور ہندو راشٹر کی بات کرنے والی پارٹی مرکز میں تیسرے نمبر کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی تھی۔ بھارت سادھو سماج ، ہندو مہاسبها، رام راجیہ پریشد جیسے سنگھٹنوں کی ندیاں ہندوواد کی خاص سیاسی مبل دھارا میں اپنے وجود سے محروم ڈاکٹر دنیش منوہر وا کانگر حالیں کہ اپنے سنکاروں سے ہندو تھے لیکن مسلسل مطالعے اور غوروفکر سے ان کے اندر رفتہ رفتہ بھگتی اور روحانیت کے عناصر بھی گہرائی میں پیدا ہور ہے تھے۔ وہ کسی بھی تشدد یا ظلم کو دیکھ کر بے چین ہو اٹھتے تھے۔ خاصی طور پر ایک ہندو مندر کی سیڑھیوں پر اسی سال کے بوڑھے گاندھی کے ایک ہندو مہاسبھائی کے ہاتھوں قتل کو ان کا ضمیر اور دل جائز تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ کئی بار جب وہ اس معاملے میں اپنی راے کا اظہار کرتے تو سنگھ کے دانشور عہدے دار ان کے سامنے سور گیر شیاما پرشاد مگر جی اور دین دیال اپادھیائے کی مشکوک موت کی مثال

ہونے کے لیے بڑھ رہی تھیں ، ختم ہورہی تھیں۔ وقت گزر رہا تھا لیکن ڈاکٹر واکانکر کا ودھان پور سے تبادلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہرونش پنڈت جیسے سادہ لوح ، غریب اور بد باقی کارکنوں کو دیکھ کر سنگھ کی سر گرمیوں کے لیے ان کا جوش

و خروش اور بڑھ گیا تھا۔ برونش پنڈت شاکھا کی سر گرمیوں کی کھڑکی کے پار اپنی جمانی کی حیات نو کا منظر دیکھتے۔

ان کا من کھتا ، " بھائی جیوں " پر یقین کرو۔ بمبئی سے آنے والے بھائی جی نے کہا تھا کہ گوتم بدھ نے اور مہاویر سوامی نے ہندو دھرم کو بہت نقصان پہنچا یا۔ اگر شنکر آچار یہ نہ ہوئے تو بھارت سے ہندو دھرم نیست و نابود ہو جاتا۔ بعد میں راجہ رام موہن رائے، گاندھی اور نہرو جیسے لوگوں نے بھی ہندو دھرم کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ

لوگ مغربی ذہنیت کے انسان تھے۔ بھائی جی لوگوں کی باتوں کا شاکھا کے عام ممبروں پر گہرا اثر پڑا۔ ویدک زمانے سے لے اب تک کی ایک بالکل مختلف تاریخ ان کے ذہنوں میں بہت آسان اور فطری انداز سے ثبت کر دی گئی تھی۔ شاکھا کے بیشتر ممبروں کے گھروں میں مہارانا پرتاپ، چھترپتی شواجی، گرو گولوالکر ، شیاما پرشاد مگر جی کے فوٹو آویزاں نظر آتے تھے۔

۲۷۶

ادے پر کاش

پیش کرتے ہوے کہتے کہ ہندو راشٹر کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے تشدد کا راستا بالکل نہ اپنانے کی بات نہیں سوچی جا سکتی، خاص طور پر ان حالات میں جبکہ دوسرے فرقے بھوں اور بندوقوں سے مسلح ہو رہے ہیں اور انھیں باہری ٹریننگ بھی مل رہی ہے۔ وہ جوش میں کھتے کہ اپنے ہی ملک کی آزادی اور دوسروں کی غلامی اور استحصال سے بچنے کے لیے ہندوؤں کو رامائن، مہا بھارت اور ویر نایکوں اور جنگجوؤں جیسا انداز اپنانا ہو گا؛ اپنے تحفظ کے لیے جنگ اور تشدد کا راستا تو شری کرشن نے گیتا میں پہلے ہی دکھا دیا ہے۔ ٹھکرا مہاراج تھے تو پینسٹھ برس کے لیکن ایسا وعظ سنتے ہی ان کی بوڑھی ہڈیوں میں نیا جوش بھر جاتا۔ وہ کسی بوڑھے آدم خور شیر کی طرح ہنکارے بھر نے لگتے، حالاں کہ وہ پچھلے بیس برسوں سے پرانے دمے کے مریض تھے۔ وہ لاٹھی چلاتے ، لیزم بجاتے ، میدان میں تھوڑا بہت دوڑتے اور انھیں لگتا کہ لاٹھی، لیزم اور تشدد کے ذریعے ہندو راشٹر ، ورن آشرم حالت اور جمانی کے مقاصد اپنے جیسے ہی ضرور حاصل کر لیں گے۔

الجھن اور تذبذب

شہر کے سب سے بڑے کپڑا بیوپاری شهری کومل چند گیت، جو علاقائی شاکھا کے منتظم بھی تھے، کہتے تھے کہ اتنی حسین اور اتنی سائنٹیفک تقسیم تھی ہندو سماج کی؛ اسے مسلمانوں، عیسائیوں ، سوڑوں اور جوان ترک ذاتوں نے برباد کر ڈالا۔ سب کچھ درست اور جوں کا توں کرنے کے لیے ہندوؤں کو اپنے اندر ہٹلر پیدا کرنا ہو گا۔ گرو گولوالکر جی نے بھی بہترین جرمن نسل کی بھلائی کے لیے کی گئی ہٹلر کی کارروائیوں کی تعریف کی تھی۔ ڈاکٹر وا کانگر بھر پور عقیدت اور لگن کے ساتھ سنگھ کی پبلسٹی میں لگے تو ضرور تھے لیکن بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے چیزوں کو گہرائی سے جاننے اور سمجھنے کے ناقابل تسخیر نجس نے ان کے ذہن کو کبھی چین نہیں لینے دیا۔ انھوں نے نیٹے کو پڑھا، ”میں کان کو دیکھا، گروہی کی کتاب "بی آنڈ اور نیشن مڈ ڈیفائنڈ“ پڑھی۔ وہ الجھنوں میں گرفتار ہوتے گئے۔

اور امت میں بیدار تھنا ۲۷۷

ڈاکٹر واکا نگر اگر بہترین اور کمترین انسانی نسلوں کے اصول سے ایک بار متفق بھی ہو جاتے تب بھی ان کا ضمیر اسے قبول نہ کرتا۔ ان کی روح کھتی کہ اگر یہ بیچ بھی ہو تو کمترین نسلوں کو مارا یا ستا یا کیوں جائے؟ اگر یہ مان بھی لیں کہ جرمن نسل کے مقابلے میں یہودی، نیگرو، منگول ، میکسیکن یا ہندوستانی نسلیں کمتر اور شوور ہیں تو کیا انھیں اس زمین پر رہنے، جینے، پیار کرنے، اور

اپنی دنیا بنانے کا کوئی حق نہیں ہے ؟ ڈاکٹر واکانکر تو ڈاکٹری کے پیشے میں آئے ہی اس لیے تھے کہ وہ مرتے ہوے انسانوں کو نیا جیون دیں۔ ایسے اصول جو جغرافیائی، نسلی، اور جینیٹک اسباب سے کم ترقی یافتہ یا پس ماندہ نسلوں کو زمین سے نیست و نابود کرنے پر آمادہ ہوں، انھیں کچھ کچھ حیوانی اور شیطانی اصول لگتے ۔ کیا دھرتی پر صرف جرمن اور یونانی ہی رہیں گے ؟ کیا بھارت میں صرف کشمیریوں اور پنجابیوں ہی کو رہنا چاہیے ؟ اگر دنیا میں صرف بہترین نسلیں ہی حکومت کریں گی تو پھر لاغر، روئیں دار ٹانگوں ، پھولے پچکے پیٹ اور اوسطاً ساڑھے پانچ فٹ والے اونچائی والے، بے ڈھنگے، ہریلے، توندیل، کا لے کتھئی ہندوستانی کہاں جائیں گے ؟ ڈاکٹر و نیش منوہر وا کا نگر نے اپنی ڈائری میں لکھا:

"زولوجی کا شروع سے طالب علم کے ہونے کے ناتے میں نے میڈیل اور ڈارون کے اصولوں اور جان داروں کے ارتقا کے بارے میں نظریات کا مطالعہ کر لعہ کر رکھا ہے۔ میں سروائیول آن فٹیسٹ جیسے سنگ دل اور معدے اصول سے بھی واقف ہوں۔ لیکن کبھی کبھی اپنے اندر سے الجھنے والی روح کی آواز سنتا ہوں۔ یہ میرے ہی اندر کسی نامعلوم گوشے سے آتی ہے۔ شاید میری روح یہ چاہتی ہے کہ یہ زمین ایسی رہے جس میں صرف ترقی یافتہ اور طاقتور ذی حیات ہی کی نہیں، کم زور ، ملائم اور کم ترقی یافتہ جانداروں کی بھی رہائش ہو! ایک ایسی زمین، ہو جس میں تتلی، پتنگے، سانپ، مور، برن، خرگوش، با تھی، شیر، پیڑ پودے، گھاس پھوس بھی رہیں اور کالے، گورے، پہلے، کتھئی، رنگ برنگے انسانوں کی سب نسلیں اور ذاتیں بھی۔ یہ تمام فطرت، یہ کل کائنات ایشور کی کائنات ہے۔ یہ سب کچھ جو دیکھا اور آن دیکھا ہے، کسی کی تخلیق ہے، بھلا اس کی کوئی ایک مخلوق اپنی برتری کے غرور اور صرف اسی دلیل پر باقی تمام مخلوق کو برباد کرنے کا خیال کیسے پروان چڑھا سکتی ہے؟

۲۷۸

ادے پر کاش

یہ بچی تھا کہ ڈاکٹر وا کانکر ان موضوعات پر جس قدر زیادہ سوچتے، انھیں اپنے اندر کے کسی تاریک گوشے سے آتی آتما کی آواز دھیرے دھیرے واضح طور سنائی دینے لگتی۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ یہ آواز آتما ہی کی تھی۔ انھوں نے اپنی ڈائری کے اسی صفحے پر ایک جملہ الگ سے لکھا تھا۔ اس جملے کی لکھاوٹ ٹیڑھی میڑھی اور بھونڈی سی تھی؛ شاید اسے لکھتے ہوے ان کی تمام توانائی کسی گھرے خیال کا کوئی سرا پکڑنے کے لیے کوشاں تھی اور ان کی انگلیاں تنگ چکی تھیں۔

" مجھے لگتا ہے فسطائیت یا کوئی دوسرا خود پسند یا نسلی اصول خدا کے خلاف شیطان کی سازش ہے۔ اوم شانتی ! شانتی ! شانتی! "

برونش پنڈت عرف تھکر امہاراج کی موت یعنی قتل

اس روز شام کو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ یہ بے وقت کی بوندا باندی تھی۔ دو دن پہلے صبح صبح پالا گرا تھا۔ رات میں درجہ حرارت چار ڈگری سے بھی نیچے تھا۔ شہروں میں لوگ ہیٹر ، قصبوں میں سگڑھی اور گاؤں میں چولھوں اور الاؤ کے آس پاس سمٹ کر ٹھنڈ سے بچ رہے تھے۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے ہوں گے جب کسی نے ڈاکٹر واکانکر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اس وقت رضائی میں گھے ہوے تھے۔ انھوں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر سردی کے علاوہ تیز برفیلی ہوا کے جھونکے بھی تھے۔ ڈاکٹر وا کا نگر نے بر آمدے کی لائٹ جلائی تو جوٹ کے بورے کو اپنی پیٹھ پر اوڑھے ہوے ویر پور گاؤں کا سجد راکھار کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ٹھکرا مہاراج کو ڈے کا شدید دورہ پڑا تھا اور جب وہ وہاں سے ڈاکٹر وا کا نگر کو بلانے کے لیے سائیکل پر چلا تھا اس وقت تشکرا مہاراج سانس لینے کے لیے پھڑ پھڑار ہے تھے اور ان کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ ڈاکٹر وا کا نگر نے تیار ہو کر اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو وہ اسٹارٹ نہیں ہوا۔ انھوں نے سوچا شاید ٹھنڈ سے ایسا ہوا ہو گا۔ اسکوٹر کو باہر نکال کر انھوں نے سید راکھار سے دھکا

اور انت میں پرار تھنا

۲۷۹

لگوایا تب بھی اسکوٹر اسٹارٹ نہیں ہوا۔ انھوں نے پلگ نکال کر اس کا کار بن صاف کیا۔ اس کے بعد بھی اسکوٹر اسٹارٹ نہیں ہوا۔ وہ تھوڑا سا گھر گھڑا کر بند ہو جاتا تھا۔ ایکسی لیٹر پورا گھمانے یا چوک لینے پر بھی کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر واکانکر سمجھ گئے کہ سائیلنسر میں کار بن بھر گیا ہے اور پائپ اندر سے عام ہے۔ انھوں نے سائیلنسر کھول ڈالا۔ ان کے ہاتھ اور کپڑے کوئلے، موبل اور گریز اسے کالے پڑ گئے تھے۔ وہ ابھی سائیلنسر سے کار بن نکالنے ہی والے تھے کہ ان کی بیوی نے آ کر بتایا کہ اگر انھیں برونش پنڈت کو دیکھنے جانا ہے تو وہ جلدی جائیں کیوں کہ اسکوٹر ٹھیک کرتے ہوے ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا ہے۔

سجد را کمہار کی سائیکل کے بلتے ہوے کیریئر پر بیٹھ کر بوندا باندی، ٹھنڈی ہوا اور دبیز تاریکی میں گاؤں جانے والی او بڑھا بڑ کچی سڑکی سے ڈاکٹر وا کانگر ویر پور میں ٹھکر امہاراج کے گھر پہنچے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جب وہ ہر ونش پنڈت کو بتائیں گے کہ آج پاکستان فیصلہ کن طور پر دو ٹکڑوں میں ٹوٹ گیا ہے، بنگلادیش آزاد ہو چکا ہے اور دنیا کی تاریخ میں پہلی بار نوے ہزار سے زیادہ پاکستانی فوجیوں نے بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں، تو برونش پنڈت کے بیمار پھیپھڑوں میں نئی تازہ ہوا آجائے گی۔

ڈاکٹر واکا نگر کو آج صبح اخبار کے پہلے صفحے پر چھپا وہ فوٹو بار بار نظر آرہا تھا جس میں جنرل ہے ایس اروڑا کے سامنے شرم سے گردن جھکائے پاکستانی لیفٹننٹ جنرل نیازی ہتھیار ڈالنے کے کاغذات پر دستخط کر رہا تھا۔ واکا نگر سکھوں کی بہادری ، قربانی اور اس ملک کے لیے کیے گئے ان کے ایثار پر فدا ہوے جا رہے تھے۔ سوا لاکھ سے ایک لڑاؤں، تب گووند سنگھ نام کھاؤں۔ دسویں گرو گووند سنگھ نے ہندوؤں کی حفاظت ہی کے لیے تو کھڑک اختیار کیا تھا۔ لیکن مٹی کے اس چھوٹے سے گھر میں صرف کیروسین کی ایک ڈھبری جل رہی تھی جس کی لو رہ رہ کر کانپ اٹھتی تھی۔ ہرونش پنڈت کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ ایک ایک سانس کے لیے جو جہ رہے تھے۔ جیسے ہی ایک سانس پورا ہوتا، برونش پنڈت کا بوڑھا لاغر جسم اگلے سانس کو

جلد از جلد تلاش کرنے کے لیے تڑپ اٹھتا۔ شکرا مہاراج نے جب ڈاکٹر واکا نگر کی جانب دیکھا تو ان کی آنکھوں میں زندگی کی امید چھوڑ

۲۸۰

ادے پر کاش

دینے والی راکھ تھی۔ ان کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں ، لیکن ان میں ڈر نہیں بلکہ کسی جسم بھر کے بھوکے، محروم اور مفلس برہمن کی فریاد تھی ، زندگی کے صرف چند اور سانسوں کی فریاد۔ ڈاکٹر واکا نگر سے ٹھکرا مہاراج کی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ انھوں نے انھیں نیند کا انجکشن لگا یا اور بیل گاڑی میں لا کر ابتدائی مرکز صحت، ودھان پور، کے لیے روانہ کر دیا۔ باہر ہوندا باندی تیز ہونے لگی تھی۔ رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ ہوا میں برف کی تیز دھار والی چھریاں چھپی تھیں۔ مگر امہاراج کو بیل گاڑی میں پیال بچھا کر لٹایا گیا تھا اور ان کے اوپر تر پال کا مہاجن بنا دیا گیا تھا تا کہ وہ بھیک نہ جائیں۔ انجکشن کی وجہ سے وہ گہری نیند میں تھے۔ ڈاکٹر واکا نگر پرانے دمے کے مریضوں سے بخوبی واقف تھے؛ جب ان پر دمے کا دورہ پڑتا ہے تو وہ ایسی حالت میں پہنچ جاتے ہیں جیسے بس اب ان کی آخری گھڑی آ گئی ہے، لیکن انھوں نے اپنے برسوں کے تجربوں سے یہ سمجھ لیا تھا کہ دے کے مریضوں کی اوسط عمر دوسرے مریضوں ہی نہیں صحت مند لوگوں کے مقابلے میں بھی زیادہ ہوتی ہے۔ انھوں نے دے کے مریضوں کو اسی نوے سال تک یوں ہی جیتے ہوے دیکھا تھا۔ شکرا مہاراج گہری نیند یا سیمی کوما میں تھے۔ ڈاکٹر واکا نگر مطمئن تھے۔ رات کے پونے تین بلکہ انھوں نے سٹر یونما سے کہا کہ وہ برونش پنڈت کو گلو کوز چڑھا دیں۔ یو نما ودھان پور میں صوبائی مرکز صحت کے دیے ہوے دو کمروں کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ وہ بہت دبلی پتلی تھی اور اسے ایگزیما تھا۔ اس کا گھر ہسپتال سے متصل تھا۔ ڈاکٹر واکا نگر تقریباً تین چالیس پر گھر لوٹے تھے۔ وہ بری طرح تھک چکے تھے۔ آنکھیں نیند سے بھاری ہو رہی تھیں۔ ٹھنڈ، نمی، موبل اور گریز کی بو، کالک اور تھکان۔ انھیں یاد آیا کہ انھوں نے رات میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ ان کی بیوی اور بیٹیاں سورہی تھیں۔ وہ کسی کو جگائے بغیر کچن میں تھے۔ سارے برتن دھیلے دھلائے رکھے تھے۔ انھوں نے فرج کھول کر دیکھا۔ اس میں دودھ اور چند کیلوں کے سوا پکے ہوے کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ لوٹ کر اپنے بستر پر گر گئے تھے اور دس منٹ کے اندر ہی ان کے خراٹے بلند ہونے

لگے۔ صبح ساڑھے پانچ بجے ہی کسی نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ جیو کہنا واکانکر نے، جو اس

اور امت میں پردار تھنا ۲۸۱

وقت پھٹے ہوے پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں ملبوس تھیں، اٹھ کر دروازہ کھولا۔ آسمان میں بے وقت کے بادل ابھی چھٹے نہیں تھے۔ باہر سٹر یو نما الٹی سیدھی حالت میں کھڑی تھیں۔ ساتھ میں سجد را کہار تھا۔ تھکرا مہاراج کا لڑکا پنڈت بھولا شنکر دو بے عرف کیدھا مہاراج بھی کچھ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ جیو تسناوا کا نگر کا بایاں پستان پھٹے ہوے بلاؤز سے باہر جھانک رہا تھا اس لیے وہ فوراً مڑ کر اندر آ

گئیں۔ ڈاکٹر واکانکر کو بیدار کرنے میں کافی محنت کرنی پڑھی؛ وہ بہت گہری نیند میں تھے۔ بیدار ہونے کے بعد ان کی آنکھیں بری طرح سے لال تھیں جیسے ان میں خون اتر آیا ہو۔ ویسے ایسا بائی بلڈ پریشر یا بلڈ پریشر کے غیر متوازن ہونے سے ہوتا ہے۔

سٹر یونما نے جب بتایا کہ ہرونش پنڈت کی موت ہو گئی ہے تو ڈاکٹر وا کانکر کو سمجھنے میں تھوڑا وقت لگا۔ پھر انہیں تعجب ہوا اور شدید صدمہ بھی محسوس ہوا۔ ان کی نیند کافور ہو گئی۔ وہ اسی حالت میں، ہاتھ منھ دھوئے بغیر، چپل پہن کر لپکتے ہوے ہسپتال پہنچے۔ پنڈھائی باہر بر آمدے میں بیٹھی زور زور سے رو رہی تھیں۔ ساتھ میں گاؤں کی دو ایک عور تیں اور کچھ مرد تھے۔ برونش پنڈت کی بہو بھی وہاں تھی۔ ڈاکٹر واکانکر نے ابتدائی مرکز صحت، ودھان پور، کے انڈور پیشنٹ نمبرے ا ، هری برونش پنڈت عرف شکرا مہاراج، ساکن در یہ ویر پور، تھانا اور پوسٹ آفس ودھان پور، ضلع رائے گڑھ پن کوڈ۷۵۲۰۰۳، کو دیکھا۔ مردہ جسم لوہے کے پلنگ پر پڑا تھا۔ ایک ہاتھ چھاتی پر تھا۔ ڈاکٹر و نیش منوہر وا کانگر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، کی نگاہ اسٹینڈ پر لٹکتی گلو کوز کی بوتل کی جانب گئی۔ وہ سمجھ گئے۔ انھیں یہی شک ہوا تھا۔ بوتل کے اندر اس کے صاف شفاف سیال کی سطح پر فنگس کے نکلے تیر رہے تھے۔ یہ شاید کسی میڈیکل اسٹور سے ایکسپائری کے بعد کی بلیک سپلائی ہے۔ ہشیارے! “ وہ بڑبڑائے۔ انھوں نے لیبل پر پڑھی ہوئی ایکسپائری کی تاریخ دیکھی۔ اس جگہ لکھی تاریخ کو چاقو کی نوک سے کھرونچا گیا تھا۔ اس کے باوجود تاریخ سمجھ میں آئی تھی۔ ابتدائی مرکز صحت ، ودھان پور، کے چیف ڈاکٹر اور انچارج ، ڈاکٹر ڈی این مصرا، نیا بجٹ ملتے ہی ایکسپائری کے بعد کی دوائیں یا نقلی دوائیں فرضی فارماسیوٹیکل کمپنیوں کے ایجنٹوں یا کیمسٹوں سے کمیشن کی بنیاد پر خریدا کرتے تھے۔ انھیں کافی آمدنی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر واکانکر نے

۲۸۲

ادے پر کاش

اس پر کئی بار اعتراض کیا تھا، جس کے بعد واکا نگر کے کئی حقیقی بلوں اور رسیدوں کا بھگتان لمبی مدت تیک روک دیا گیا تھا اور ان کی چھٹی کی درخواستیں منظور نہیں کی گئی تھیں۔ چیٹ میڈیکل آفیسر ڈاکٹر ڈی این مصرا کی مقامی نیتاؤں، تاجروں، تحصیل دار، اور تھانے دار سمیت دوسرے سرکاری افسروں سے خوب پٹتی تھی۔ ان لوگوں نے رات میں شراب پینے اور تاش کھیلنے کے لیے ایک آفیسرز کلب بھی بنا رکھا تھا۔ اس گروپ کے الگ طور طریقے تھے جنہیں بھارتی حکومت نے اپنی طویل تاریخ میں حاصل کیا تھا۔ انہیں میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ کسی غیر ضروری اور ایمان دار ماتحت کو چھوٹے موٹے غیر ظاہر طریقوں سے اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوے اتنا تنگ کرو کہ وہ مجھے یاد کھ سے پھٹ پڑے اور پھر اسے قانون کے مطابق چارج شیٹ دے کر سزا دو۔ ڈاکٹر دنیش منوہر واکا نگر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پنڈ سائن کی دہاڑیں مار کر روتی ہوئی بے چین اور بوڑھی آواز پورے مرکز صحت کو بلا رہی تھی۔ برونش پنڈت ایکسپائری کے بعد کے گندے، گھٹیا اور نقلی گلو کوز کے نسوں کے اندر انجیکٹ کیے جانے سے سرکاری ہسپتال میں مرے تھے۔ ایک طرح سے انہیں قتل کیا گیا تھا۔ ٹھکرا مہاراج راشٹر یہ سویم سیوک سنگھ کے ایک باعزت دیہاتی کارکن تھے اور انہیں یقین تھا کہ ان کے جیتے جی ہی جمائی، ورن آشرم اور ہندوراج قائم ہو جائے گا اور ان کی پنڈتائی پھر سے پرکھوں کے زمانے کی طرح چل پڑے گی۔ جمانوں کے نیوتے سے وہ کسیر پوری اپنے مجھے میں باندھ کر گھر لایا کریں گے۔ اگر وہ کل کے اخباروں میں چھپا لیفٹینٹ جنرل ہے ایس اروڑا اور پاکستانی لیفٹنٹ جنرل نیازی کا فوٹو دیکھتے تو جوش میں کھتے، ڈاکٹر صاحب، دیکھو ایک روڑا ہٹ گیا، ہندوؤں کی قسمت کی رکاوٹ ہٹ گئی۔ اب اکھنڈ بھارت بن کر رہے گا۔ ست سری اکال اروڑا جی ... " اور یہ بات کہتے ہوے ان کے منہ سے تھوک ضرور نکلنے لگتا۔ اسی لیے ان کے گاؤں کے لوگ انہیں برونش پنڈت کے نام سے نہیں بلکہ تھگرا مہاراج

کے نام سے جانتے تھے۔ ڈاکٹر واکانکر نے وہیں ہسپتال میں اپنے لیٹر ہیڈ پر چیٹ میڈیکل آفیسر ڈاکٹر ڈی این مصر کو ایک بہت سخت خط لکھا۔ اس میں انھوں نے صاف صاف لکھا کہ آپ بیرونش پنڈت کے قاتل ہیں۔ آپ جیسے عیار اور لالچی ڈاکٹروں کی وجہ سے ایک نہیں ہزاروں بے قصور مریضوں کی

اور انت میں پرارتھنا

۲۸۳

موتیں ہو رہی ہیں۔ آپ انسانی زندگی کے ساتھ موت کا شیطانی اور مجرمانہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ برونش پنڈت اس ملک کے ایک شہری تھے؛ وہ اس ابتدائی مرکز صحت میں بھرتی کیے گئے ایک انڈور پیشنٹ تھے؛ وہ ایک برہمن تھے، اور شاستروں میں برہمن کے قتل سے بڑا کوئی گناہ نہیں۔ آپ جیسے ڈاکٹر تمام معاشرے اور انسانیت کے علاوہ ہندو دھرم کے لیے بھی ایک بد نما داغ ہیں۔ آپ کو میں نے کئی بار مقامی مندر میں پوجا چڑھاوا کرتے اور پر شاد چرن امرت لیتے دیکھا ہے۔ اگر آپ کو اپنے دھرم سے کوئی عقیدت ہے تو یہ واضح طور پر سمجھ لیجیے کہ آپ پاپی اور گناہگار ہیں۔ قانون کے نقطہ نظر سے بھی آپ نے جرم کیا ہے اور تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۰۴ کے

تحت آپ پر ہومی سائڈ کا مقدمہ چلایا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر واکا نگر کے اس غضب آلود خط کا آخری پیرا گراف تھا: میں اپنے ساتھ گلو کوز کی بوتل، شر ما میڈیکل اسٹور کو دیا ہوا آپ کا ۸۰ بوتلوں کا آرڈر، اور اسٹاک سے متعلقہ کاغذات لیے جا رہا ہوں۔ نقلی دواؤں ، خاص طور پر لائف سیونگ ڈرگز اور مریض کی نسوں کے اندر انجیکٹ کرنے والی انٹر اوینس انجکشنوں، کے معاملے میں مسلک اور سنگین بے ایمانی نہ کرنے کی گزارش میں نے آپ سے ایک بار نہیں کئی بار کی ہے، رسمی طور پر بھی اور غیر رسمی طور پر بھی۔ آپ نے میری درخواست پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجاے مجھے طرح طرح سے تنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپ ناسمجھی میں یہ جرم نہیں کر رہے کہ بلکہ دراصل آپ پیشہ ور مجرم ہیں۔ میں اپنے دھرم ، اپنے پیٹے اور ایشور کی قسم کھا کہ آپ کو آگاہ کرتا ہوں کہ آپ اپنے کرتوتوں سے باز آئے، ورنہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کس حد تک جا سکتا ہوں۔"

برونش پنڈت کی موت سے ڈاکٹر وا کا نگر اتنے مغموم، افسر دہ اور تناوزدہ تھے کہ انھوں نے اس خط کو ایک لفافے میں بند کر کے ایک ہفتے کی چھٹی کی ایک درخواست بھی لکھ ڈالی اور دونوں چیزیں سٹر یو نما کو تھما کر اپنے فلیٹ میں لوٹ آئے۔ جیولسنا واکانکر اور ان کی بیٹی پوجا نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے ان میں خون اتر آیا ہو۔ وہ اپنے بستر پر گر پڑے اور جلد ہی ان کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔ ڈاکٹر واکا نگر کی آنکھوں کے اس طرح سرخ ہونے اور ناک اور گلے سے نکلتی ایسی خرخراہٹ

۲۸۴ ادے پر کاش سے جیو لسنا وا کا نگر سمجھ گئیں کہ ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے اور غیر متوازن ہے۔

ٹرانسفر کا حکم

دو پہر ڈھائی بجے تک ڈاکٹر وا کا نگر کے خراٹے گونجتے رہے۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ابتدائی مرکز صحت کا جو نیٹر ڈاکٹر سریش گپتا ان سے ملنے آیا تھا۔ اس نے تین سال قبل بی سرکاری ملازمت جوائن کی تھی۔ وہ پی ڈبلیو ڈی کے ودھان پور آفس میں ایس ڈی اور شری دین دیال گوتا، کا بھانجا تھا۔ ڈی ڈی " کے نام سے مشہور دین دیال گپتا کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ودھان پور میں آنے کے بعد اس نے گزشتہ چار برسوں میں پینتیس چالیس لاکھ روپے کمائے ہیں۔ سڑکوں کی مرمت اور پلوں کی منظور شدہ اسکیموں میں گھپلے اور ٹھیکے داروں اور ملازموں کی ملی بھگت کے دم پر اس نے یہ کمائی کی تھی۔ ڈاکٹر سریش گوپتا اسی ڈی ڈی کا بھانجا تھا۔ چاے پینے کے بعد ڈاکٹر گپتا نے ڈاکٹر وا کا ٹکر سے گزارش کی کہ وہ گلو کوز کی بوتل، ہسپتال کے اسٹاک کے کاغذات اور شر ما میڈیکل اسٹور کو ڈاکٹر مصرا کے دیے ہوے آرڈر کی کاپی ڈاکٹر مصر ا کو لوٹا دیں۔ ڈاکٹر مصر ا ان سے ملنا چاہتے ہیں اور وہ واقعی پریشان اور دکھی ہیں۔ ڈاکٹر و کانکر نے جواب دیا کہ ان کا ڈاکٹر مصرا سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے۔ وہ اگر ان کے گھر آئیں تو انہیں خوش آمدید کہیں گے۔ رہی بات بوتل اور کاغذات لوٹانے کی تو ڈا کٹر وانگر نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں ہو گا کیوں کہ اگر یہ ثبوت انھوں نے ڈاکٹر مصر ا کو واپس کردیے تو ڈاکٹر مصر انھیں تنگ کر ڈالیں گے۔

ڈاکٹر سریش گپتا سے انھوں نے کہا کہ اپنے پاس یہ ثبوت وہ ڈاکٹر مصر ا کو سزا دلانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے تحفظ کے لیے رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی رات ساڑھے آٹھ بجے ابتدائی مرکز صحت، ودھان پور، کے چیٹ میڈیکل انچارج ڈاکٹر ڈی این مصر ا ان کے گھر تشریف لائے۔ حالاں کہ وہ ڈاکٹر واکا نگر کے پاس تھے لیکن ان کے سامنے

اورانت میں پرار تھنا ۳۸۵

اس طرح برتاو کر رہے تھے جیسے ڈاکٹر وا کا نگر ان کے آفیسر ہوں۔ جیو آسنا واکا نگر جب چاے دینے آئیں تو ڈاکٹر مصرا نے اٹھ کر انھیں بھابی کہتے ہوے آداب عرض کیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ہرونش پنڈت کی ودھوا پنڈتا ئن کو ویر پور میں دس ہزار روپے نقد دے کر آئے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر وا کا نگر کی بیوی جیو لسنا سے علیحد گی میں بات کی۔ جیو تسنا وا کانکر نے آ کر ڈاکٹر وا کانکر کو سمجھایا کہ اب جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ڈاکٹر مصرا کے دل میں سرونش پنڈت کی موت کے لیے گہری ندامت ہے۔ وہ دس ہزار روپے پنڈتا ئن کو دے ہی چکے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اگر ڈاکٹر وا کا نگر کہہ دیں تو وہ انھیں اور بھی روپے دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مصرا نے ڈاکٹر وا کانکر کی خوب خوب تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ ان جیسے بے لوث اور مثالی ڈاکٹر محکمہ صحت کی شان ہیں۔

خیر، بعد میں یہ ہوا کہ جیو تسنا واکا نگر نے اپنے شوہر سے رضامندی لے کر ڈاکٹر ڈی این مصرا سے ڈاکٹر وا کا نگر کا لکھا ہوا خط واپس لیا اور انھیں گلوکوز کی بوتل اور تمام کاغذات واپس لوٹا دیے۔ ڈاکٹر سریش گپتا اسی دن سے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کا ممبر بن گیا۔ اس نے ڈاکٹر وا کا نگر کی قدم بوسی کرتے ہوے کہا کہ آج سے وہ بھی ان کی طرح ہسپتال میں دھاندلی کے خلاف جنگ کرے گا۔

ڈاکٹر و نیش منوہر واکا نگر اداس تھے۔ برونش پنڈت کی موت دے سے نہیں ہوئی تھی؛ انھیں قتل کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس رات ڈائری میں لکھا:

" مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہمارے ملک میں ہر روز ہزاروں قتل ہو رہے ہیں ، نقلی دواؤں ، زہریلی شراب، غنڈوں اور مجرموں کے منتظم گروہوں اور پولیس کے استحصال اور حکومت کی گولا باری سے ۔ اس کا کسی مذہب اور فرقے سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک مکمل طور پر بگڑا ہوا اور مجرم نظام بن چکا ہے جس کے تشدد اور کوٹ پاٹ کے سامنے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ سامنے والا ہندو ہے یا مسلمان یا کسی اور فرقے کا۔ بنگلادیش میں بھی مسلمانوں ہی نے مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا؛ ہزاروں عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا تھا اور لاکھوں مہاجروں کو ان کے گھر

گاؤں سے اجاڑ کر خانہ بدوش بنا دیا گیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے ملک میں ہندو ہی ہندوؤں کے ہاتھوں ہلاک کیے جا رہے ہیں ۔ ڈاکٹر

۲۸۶

ادے پر کاش

ڈی این مصرا بھی ہندو تھے اور بیرونش پنڈت بھی۔ مسلک دواؤں کے تاجر بھی ہندو ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان میں سے کئی ہندو راشٹر نظریے کے ہم درد ہیں اور سنگھ کو مالی امداد دیتے رہتے ہیں۔" ڈاکٹر وا کانگر نے ڈائری کے اس صفحے پر آخر میں ایک سوال لکھا تھا: " یہ سوال بار بار میرے ذہن میں انگڑائیاں لیتا ہے کہ اگر کبھی مستقبل میں ہندو راشٹر بنا تو وہ کس ہندو کاراشٹر ہو گا \_\_ ڈاکٹر ڈی این مصر کا یا تھکرا مہاراج کا ؟" ابھی ایک ہفتے کی چھٹی چل رہی تھی۔ ڈاکٹر واکا نگر ہسپتال تو نہیں جارہے تھے لیکن شام کو شاکھا میں باقاعد گی سے جاتے تھے۔ وہاں انہیں رام سنی بھائی جی نے بتایا کہ ڈاکٹر سریش گوتا ابھی تین دن سے شاکھا میں آ رہا ہے لیکن اس نے ابھی سے ان کے بارے میں اناپ شناپ بائیں پھیلانا شروع کر دی ہیں۔ رام سنی بھائی جی نے کہا کہ کہیں ڈاکٹر سریش گپتا کو ڈاکٹر مصرا ہی نے تو شاکھا کا ممبر نہیں بنوایا ہے تا کہ وہ وہاں ڈاکٹر واکا نگر کی جڑیں کاٹ سکے۔ پانچویں دن ہیڈ آفس کے سرکاری ہسپتال سے ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر، ڈاکٹر این ای اگنی ہوتری، سول سرجن، کے آرڈر نمبر ۲۶ دی ۱۳۷۱ کے تحت ڈاکٹر دنیش منوہر وا کا نگر کا تبادلہ دور دراز آدی واسی علاقے ڈھینگر گاؤں کے ابتدائی مرکز صحت میں کر دیا گیا۔ انہیں اڑتالیس گھنٹے کے اندر اپنا تمام کام ڈاکٹر سریش گپتا کے حوالے کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اگلے دن ضلع رائے گڑھ سے نکلنے والے ہفتہ وار اخبار ”رائے گڑھ وافی " میں سرونش پنڈت کی ودھوا پنڈتا ئن رم وتی کی جانب سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے نام ایک خط چھپا تھا جس میں اپنے شوہر کی موت کی ذمے داری انھوں نے ڈاکٹر وا کا نگر پر عائد کی تھی اور انتظامیہ سے درخواست کی تھی کہ ہرونش پنڈت کی موت کی مکمل تحقیقات کرائی جائے۔ جیو لسنا واکا ٹکر کے لیے یہ بے ایمانی اور سازش ناقابل برداشت ثابت ہو رہی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ پھر وہ ڈاکٹر ڈی این مصرا سے براہ راست دو ٹوک بات کرنے کے لیے ان کی قیام گاہ کی طرف چلیں ۔ ڈاکٹر وا کا نگر نے منع کیا لیکن بے سود۔ انھوں نے کہا کہ “میں جا کر اس

کا منہ نوری لوں گی۔“ جیو تسنا وا کا نگر جب ابتدائی مرکز صحت، ودھان پور، کے چیٹ میڈیکل آفیسر اور انچارج ، ڈاکٹر ڈی این مصرا، کے بنگلے پر پہنچیں تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ پتا چلا کہ مصرا اپنی فیملی کے ساتھ ایل

اور امت میں پرارتھنا ۲۷۳